یا مجیب السائلین

وہ ٹی وی آن نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بے چینی کے باعث ٹی وی بند کرکے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں کروڑوں لوگوں کی طرح امامہ نے بھی ہوٹل کے کمرے میں سالار سکندر کو اس اسٹیج پر لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کا آغاز کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وہ سرد اور تقریباً" بے حس و حرکت وجود کے ساتھ کسی بت کی طرح اس شخص کو ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کے وجود میں کہیں حرکت تھی تو اس کے دل سے [illegible] کی۔ جو اتنی بلند تھی کہ اس وقت اس کے پاس بیٹھا کوئی شخص بھی سن سکتا تھا یا پھر اس زبان پر اس شخص کی زندگی کے لیے کی جانے والی دعاؤں کی جنہیں اللہ سن رہا تھا۔

سالار سکندر نے زندگی میں بہت ساری تقریریں کی تھیں لیکن ان میں سے کوئی تقریر بھی لاکھوں کے ایک ایسے مجمع کے سامنے نہیں تھی جس سے وہ انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

وہ Lingala (مقامی زبان) میں ان سے بات کررہا تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ ترجمہ ہو کر ٹی وی کی اسکرین پر نظر آرہا تھا۔ پوری دنیا میں کی جانے والی ٹی وی کوریج میں سواحلی اور لنگالا میں کی جانے والی وہاں کے مقامی لیڈرز کی ہر تقریر کو انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کرکے پیش کیا جارہا تھا۔ امامہ کو اندازہ تھا اور نہ ہی سالار سکندر کو کہ وہ آج افریقہ کے اس سیاہ فام مجمع کے سامنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ کو دہرائے گا۔ وہ الفاظ جن کی بازگشت سے وہ ہمیشہ چھپتا رہا تھا وہ اس کے لاشعور سے تصور کا سفر طے کرکے زبان پر آکر نہیں رکے تھے' وہ لاکھوں کے اس مجمع کے سامنے ادا ہو کر کروڑوں لوگوں تک پہنچے تھے۔

اس نے بسم اللہ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا ہمیشہ کی طرح۔ اس نے مجمع کو قرآنی آیات سنائی تھیں۔ کہ عزت اور ذلت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر مجمع کو دیکھا تھا اور پھر جیسے اس کا ذہن خالی ہوگیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیا کہنا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دوبارہ روسٹرم پر رکھے اس کاغذ پر نظر دوڑائی تھی جس پر اس نے اس تقریر کے نکات لکھے تھے۔ وہ ساری عمر صرف نکات نوٹ کرکے ہی تقریریں کرتا رہا تھا۔ اپنی یادداشت اور اپنے علم پر ایسا ہی اندھا یقین رکھتا تھا وہ اور اب وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ بے وقوفوں کی طرح اس مجمع کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اگلے الفاظ کے منتظر تھے۔ اس کے پچھلے الفاظ ان کے سر سے گزرے تھے۔ افریقہ کے وہ قبائل جو اس وقت وہاں اکٹھے تھے وہ آج بھی اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے' نہ ہی اللہ کے وجود کو پہچانتے اور مانتے تھے۔ وہ بہت سی دوسری چیزوں کو اعلا' برتر لگتے تھے۔ ان کے لیے وہ رب (جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے) بھی اتنا ہی ناآشنا تھا جتنا وہ "رب جو عزت اور ذلت عطا کرنے پر قادر تھا۔" سالار سکندر کو اب ایسا اور کیا کہنا تھا جو سمجھ میں آتا اور بہت آسانی سے آتا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے آخری خطبہ یاد آیا تھا۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن کا حصہ ہوں جس نے ماضی میں اس خطے اور آپ لوگوں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو کمتر سمجھا گیا۔ آپ لوگوں کے حقوق چھینے گئے' آپ لوگوں کے وسائل اور امانتوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ میں اس سب کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میں ایک ایسے مذہب کو ماننے والا ہوں جو یہ سب "گناہ" قرار دیتا ہے۔ میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جس کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) امانتوں میں خیانت سے منع کرتے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرنے کی تلقین کرتے تھے جو اپنے لیے۔ جنہوں نے بتایا "کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر برتری حاصل نہیں ہے۔" وہ انسانی مساوات کی بات کرتے تھے۔ ذات پات' رنگ و نسل' چھوت چھات کو نہیں مانتے تھے۔

سالار سکندر حافظ تھا، مبلغ نہیں تھا۔ مقرر تھا، مفسر نہیں تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے پروفیشن میں مذہب کو لانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ آج بھی اس نیت سے وہاں نہیں آیا تھا پر اس وقت جو بھی اس کی زبان سے نکل رہا تھا وہ دل کی آواز تھی اور دلوں تک جا رہی تھی۔

افریقہ میں غیر انسانی حالات میں رہنے والا وہ سیاہ فام مجمع اس کی باتیں سن رہا تھا اور اب پہلی بار ساکت وصامت، خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور اس خاموشی کو ایک بے اختیار داد و تحسین نے توڑا تھا۔ یہ داد سالار سکندر کے جملے پر نہیں ملی تھی۔ یہ داد نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزماں کے آخری خطبے کے ایک بنیادی فلسفے کو ملی تھی۔ وہ اللہ کا پیغام تھا جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے چودہ سو سال پہلے آیا تھا اور آج چودہ سو سال بعد بھی وہ پیغام دلوں کو تسخیر بھی کر رہا تھا، ان پر مرہم بھی رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ پیغام انسانیت کے لیے تھا۔ قیامت تک کے لیے تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے لوگ اب بھی گنگ تھے۔ لاکھوں کا وہ مجمع اس آدمی کو اپنے رعب میں نہیں لے پایا تھا لیکن اس آدمی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس لاکھوں کے مجمع کو جیسے اس کی مٹھی میں لے آئے تھے۔ سالار سکندر نے وہ اسم اعظم پڑھتے ہوئے افریقہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا جو چودہ سو سال پہلے بھیج دیا گیا تھا۔

امامہ بھی دم بخود تھی۔ وہ شخص کس جگہ کھڑا کیا دہرا رہا تھا اور اگر اسے اس آخری خطبہ کا یہ حصہ یاد تھا تو یہ کیسے ممکن تھا باقی حصہ یاد نہ ہو تک اور یاد تھا تو اس لیے کہ وہ کہیں گڑ گیا تھا۔

"یہ لوگ بابا کے لیے تالیاں کیوں بجا رہے ہیں؟"

وہ جبریل کے سوال پر جیسے چونک پڑی تھی، وہ اس کے پاس بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ امامہ صرف اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

تالیوں کی گونج اب تھم رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بجتی رہی تھیں۔ اتنی دیر تک کہ سالار سکندر کو یاد آگیا تھا کہ اسے آج وہاں کیا کہنا تھا لیکن اب اپنے بھولے ہوئے الفاظ یاد آنے پر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ تاثیر اس میں تھی جو بھول کر یاد آیا تھا۔

"میں افریقہ میں اپنے مذہب کے ان ہی اصولوں اور اسی سوچ کے ساتھ کام کرنے آیا ہوں اور کام کروں گا اور میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان اصولوں پر آپ لوگوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کروں گا۔ جن کے خلاف پیٹرس ایباکا نے جنگ کی اور جن سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی۔"

سالار سکندر کہہ رہا تھا۔

"لیکن ایباکا نے اپنی جان اس لیے قربان نہیں کی کہ وہ اپنے لوگوں کو بدترین حالات میں جیتا دیکھے۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے خواب دیکھتا تھا ایک اچھی زندگی کے خواب۔"

سالار سکندر اب انہیں ایباکا کی آخری ای میل سنا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جب تم سے پہلی بار ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔

میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی ایک بونا تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا، اپنے لوگوں کے لیے اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا، مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ ابھی امید زندہ ہے۔ تمہاری صورت میں۔ اور میں ٹھیک تھا میں نے امید نہیں چھوڑی۔ جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں

لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔ ہم چھوٹے کالے بدصورت معمولی انسانوں کے بارے میں۔ جو دنیا میں مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے انسانوں جیسی زندگی جانوروں جیسی نہیں۔"

مجمع سالار سکندر کے ہر جملے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ ایاکا کی آخری ای میل نہیں بلکہ آخری وصیت تھی جو صرف سالار سکندر کے پاس تھی۔

"اور ایاکا کا جو خواب کانگو کے لیے دیکھا تھا وہ بھوک، جنگ اور بیماری کا خواب نہیں تھا وہ امن اور انسانیت پر یقین رکھتا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ امن ہی کی بات کرتا رہا اور یہ امن وہ اپنے لیے نہیں آپ لوگوں کے لیے چاہتا تھا اپنے لوگوں کے لیے۔ ایاکا کو اس سے بڑا خراج تحسین آپ تب تک پیش نہیں کرسکیں گے جب تک اس کانگو کو ایک جدید، ترقی یافتہ قوم اور ملک نہ بنادیں اور کانگو یہ کرسکتا ہے۔ یہ معجزہ کرسکتے ہیں اور میں اور میرا ادارہ، پیٹرس ایاکا کا یہ خواب پورا کرنے میں آپ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ ہم جانے والے کل کو نہیں بدل سکتے۔ آنے والا کل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اکیسویں صدی کا کانگو ایاکا جیسے اور بہت سے لیڈرز پیدا کرے۔ جو ترقی، امن اور کانگو کے بہتر مستقبل کا تصور لے کر آگے چلیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ یہ میرا پیغام نہیں ہے یہ ایاکا کا پیغام ہے۔ جو کسی مذہب پر کاربند نہیں تھا لیکن اللہ کے وجود کو مانتا تھا اور یہ زمین اللہ کی ہے اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔ کسی غاصب کے لیے نہیں ہے۔ سامراج کے لیے نہیں ہے۔ سب کے لیے ہے۔ کانگو کے لوگوں کے لیے ہے۔"

لاکھوں کا وہ مجمع جو چند لمحے پہلے تک ایک ناقابل تسخیر پہاڑ لگ رہا تھا اب تسخیر ہو چکا تھا۔ وہ سالار سکندر کے الفاظ پر رو رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر نعرے لگا رہا تھا۔

سالار سکندر اپنی تقریر ختم کرکے روسٹرم سے ہٹ چکا تھا۔ اس کے روسٹرم سے واپس اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے لاکھوں کا وہ مجمع سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ افریقہ، سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ وہ روسٹرم پر تب بھی تالیوں کی گونج میں تھا، وہ وہاں سے واپس بھی تالیوں کی گونج میں ہی ہوا تھا لیکن اب ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ دس منٹ کی تقریر کے لیے گیا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہاں سے ہٹ سکا تھا۔ اور وہ اس کی زندگی کا طویل ترین تو تھا، کٹھن تھا، صرف اس ہی کی نہیں امامہ کی زندگی کا بھی۔ آنسو صرف اس مجمع کی آنکھوں سے ہی رواں نہیں ہوئے تھے۔ امامہ کی آنکھوں سے بھی برسنے لگے تھے۔ وہ مجمع سالار سکندر کو اپنا نجات دہندہ کے طور پر دیکھتے ہوئے رو رہا تھا اور امامہ ہاشم اس "نجات دہندہ" کی جان ایک بار پھر بچ جانے پر۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں ممی؟" جبریل نے کچھ پریشان ہو کر ماں کو دیکھا تھا جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ بھی بولے بغیر گم صم ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی، اس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر اور اب ایک دم رونے لگی تھی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر اسے لپٹا لیا۔ انسان روتا کیوں ہے؟ یہ آسان سوال کبھی کبھار الجبرا کا سوال بن جاتا ہے۔

وہ دس منٹ سالار کو جیسے شرم ساری کے سمندر میں ایک بار پھر غرق کر گئے تھے۔ وہ آج جس آخری خطبے کے الفاظ یاد آجانے اور دہرا دینے پر اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ آخری خطبہ اس کے اپنے ضابطہ حیات کی عکاسی کیوں نہیں کر پایا تھا۔ اس پر عمل اس کی زندگی کی ترجیحات میں کیوں شامل نہیں تھا۔ یاددہانی تھی جو اسے بار بار کرائی جارہی تھی۔ تنبیہہ تھی جو اسے دی جارہی تھی جو "ارادہ" "نیت" تھا اسے "مشن" بنا دینے کے لیے ضروری تھا۔ سالار سکندر ان دس منٹوں کے بعد اسٹیج پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔ اس کی زبان پر اب بھی آیات تھیں، شکر کے الفاظ تھے۔ اس رب نے آج بھی ہمیشہ کی طرح اس کی عزت رکھی تھی۔ اس ذات نے اس حافظ قرآن کو دنیا کے سامنے رسوا نہیں کیا تھا اور اس احساس نے صرف تشکر ہی نہیں شرم ساری بھی بڑھا دی تھی۔

٭ ٭ ٭

"تمہیں پتا ہے تمہارے اندر خودکشی کرنے کی خواہش آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح نو سال پہلے تھی۔"

سالار سکندر نے لیپ ٹاپ پر آخری ای میل کا جواب دیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے امامہ کی آخری پھنکار سنی۔ بچے سوچکے تھے اور وہ ہوٹل کی وارڈروب کھولے پتا نہیں کتنی بار اپنے اور اس کے کپڑوں کو تہہ کر کرکے رکھ رہی تھی۔ کبھی وارڈروب کے ایک خانے میں پھر دوسرے خانے میں پھر سے پہلے خانے میں۔ اور سالار یہ سب نوٹس کرنے کے باوجود لیپ ٹاپ پر ای میلز چیک کرنے اور اپنے اگلے دن کے شیڈول کو حتمی شکل دینے میں مصروف رہا تھا اور اب جب وہ اپنا کام نمٹا چکا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی اسے اندازہ تھا۔ جو کچھ آج ہوا تھا اس کے بعد وہ اس کے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" سالار نے لیپ ٹاپ بند کرکے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ہوٹل واپس آیا تھا اور دو گھنٹے سے اپنا کام لیے بیٹھا تھا اور اب جب کام ختم ہو گیا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کی خاموشی اور بے اعتنائی کے مظاہرے پر اب تقریباً" روہانسی ہو چکی تھی۔

"تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری کیوں ضرورت ہے اور میں کیوں فکرمند رہتی ہوں تمہارے بارے میں؟؟"

وہ اس کے اعتراف پر برہم ہوئی تھی اور بے حد خفگی سے ہاتھ میں پکڑی اس کی شرٹ تیسری بار تہہ کرکے رکھنے کے بجائے اسی طرح وارڈروب کے خانے میں ٹھونس کر اسے بند کرتے ہوئے سالار کے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی۔ "کیونکہ بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم کوئی سپرمین نہیں ہو کہ وہ تمہارے کمالات دیکھ کر تالیاں بجائیں گے لطف اندوز ہوں گے۔ تمہیں کچھ ہو گا تو"

وہ بات کرتے کرتے پھر روہانسی ہو گئی۔ بات مکمل نہیں کر سکی۔ وہ گہری خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا سر جھکا کر۔ پھر اس کے خاموش ہو جانے پر اس نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی اور وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں لگی ہوئی لائٹس کی زرد روشنی میں اس کی سرخ آنکھیں اور سرخ ناک اس کے روتے رہنے کو چھپے اور نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ان ہی آنکھوں سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ اور آنکھیں تھیں جو اسے کھوجنے کی صلاحیت رکھتی تھیں سب بے بس کرنے کی اضافی خصوصیت کے ساتھ۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" جواب پہلے سے مدھم آواز میں آیا تھا اور وہی آیا تھا۔ وہ اور برہم ہوئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہی۔" اسے لگا تھا جیسے وہ اسے ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہا تھا۔

"اب اگر تم نے ایک بار پھر یہ جملہ دہرایا تو میں اس کمرے سے چلی جاؤں گی۔ تمہیں میری ہر بات احمقانہ لگ رہی ہے۔"

"یو آر رائٹ۔" وہ اس بار تنگ ہو کر جھلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ پھر اس کے پاس بستر پر بیٹھ گئی۔

"آخری خطبہ سنا رہے تھے آج تو سارا سناتے۔ ادھوری بات کیوں کی۔" وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔

"ہمت نہیں پڑی۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم جو بھی کہتی رہی ہو۔ ٹھیک کہتی رہی ہو پہلے بھی۔ آج بھی۔"

وہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے ایسا اعتراف کر رہا تھا۔ امامہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ پہلے بھی نہیں تھا پر جو گلہ تھا وہ بھی یکدم غائب ہوا تھا۔

"پیٹرس ایباکا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک امن کے لیے لڑا۔ وہ نیویارک کی ایک سڑک پر اپنی جان بچانے کے لیے لڑ رہا ان ہی طاقتوں کے ہرکاروں سے کے ساتھ جن کے ساتھ تم کھڑے ہو اور جن کے ساتھ تم مل کر افریقہ

کی مقدر پر دستک دینا چاہتے ہو۔"
اس نے سالار سکندر کو وہ آئینہ دکھایا تھا جو اسے صرف امامہ ہاشم ہی دکھا سکتی تھی۔ "تم سمجھتے ہو وہ تمہیں یہ سب کرنے دیں گے؟"
"تم سمجھتی ہو میں یہ سب کرنا چاہتا ہوں؟" اس نے جواباً اس سے پوچھا تھا اسی انداز میں۔ وہ بول نہیں سکی سوال عجیب تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر امامہ نے پوچھا۔
"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"
"میں اپنے لیے ایک باعزت راستہ چاہتا ہوں۔ اپنے لیے تمہارے لیے اپنے بچوں کے لیے۔ جس دلدل میں میں اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو پھنسا چکا ہوں اس سے نکلنا چاہتا ہوں لیکن میں ایک کنویں سے نکلنے کی کوشش میں کسی دوسرے کنویں میں کودنا نہیں چاہتا۔ جو اس سے زیادہ گہرا اور تاریک ہو۔"
وہ اس کا چہرہ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جس ایشو پر وہ بحث کرنا چاہتی تھی وہ اس پر پہلے ہی گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور وہ سمجھنا چاہتی تھی۔
"تم کیا کرنا چاہتے ہو سالار؟" وہ ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
"میں پہلا اسلامی مالیاتی نظام بنانا چاہتا ہوں۔ جو سود سے پاک ہو لیکن جو پوری دنیا کے لیے ہو باضابطہ قابل عمل اور جو اس کی جگہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔" جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیرانی سے سالار سکندر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بول ہی نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ عجیب باتیں کرتا تھا۔ وہ اب اس کی عادی ہو چکی تھی لیکن جو وہ اب کہہ رہا تھا وہ عجیب ترین تھا۔ وہ اس کی بہت ساری باتوں پر دم بخود ہوتی تھی۔ ہکا بکا بھی۔ لیکن آج اپنی خاموشی کو وہ کس کیفیت کا نام دیتی امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔
"تمہیں لگتا ہے میں نہیں کر پاؤں گا؟"
بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد اس خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ اس نے جیسے امامہ کی کیفیت کو ہی الفاظ میں نہیں ڈھالا تھا بلکہ اس نے اپنے ہر خدشے کو بھی جیسے سوال میں بدل کر امامہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ سوال لاشعور سے آیا تھا۔ یقین سے نہیں اندیشے سے ابھرا تھا۔ جواب نہیں تسلی مانگ رہا تھا۔
"یہ کام دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف تم کر سکتے ہو سالار سکندر۔"
اس بار گنگ ہونے کی باری سالار کی تھی۔ یہ جواب نہیں تھا' وہ اعتماد تھا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کا خون بڑھا تھا اور سیروں کے حساب سے بڑھا تھا۔ اس نے امامہ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس کے جواب نے اسے تسلی اور دلاسے کی وہ تھپکی دی تھی جو اس کا بوجھ ہٹا گیا تھا۔
"تھینک یو۔" امامہ کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے سالار نے اپنا تشکر اس تک پہنچایا تھا۔ وہ غیر متوقع جواب تھا۔ شکریہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی تھی امامہ کو۔ لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے منتظر تھی کہ وہ کچھ اور کہے گا۔
"تمہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" بالآخر سالار نے کہا تھا' وہ ہنس پڑی یوں جیسے اس نے کوئی عجیب بات کہی تھی۔
"تم مشکلات کی بات مجھ سے کر رہے ہو سالار؟" سالار نے اسے دیکھا۔ انداز استہزائیہ تھا پر سوال نہیں تھا۔
"زندگی میں بڑے برے دن گزارے ہیں میں نے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔
"لیکن وہ برے دن میری وجہ سے نہیں آئے تھے۔ اب شاید میری وجہ سے بھی آئیں۔ سب سے مشکل چیز

یہی ہے میرے لیے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے اثرات تم تک اور بچوں تک آئیں گے۔ واحد کمزور کرنے والی شے یہی ہے مجھے۔ اپنے آپ پر آنے والی مصیبتیں تو برداشت کر لیتا ہے انسان لیکن بیوی بچوں کو پہنچنے والی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔"

سالار کو یہ بات کرتے ہوئے وہ لمحات یاد آئے تھے جو اس نے واشنگٹن میں امامہ اور بچوں کی زندگی اور سلامتی کے لیے امید اور نا امیدی کے عالم میں گزارے تھے۔

"تم یہ مت سوچو۔ جو کرنا چاہتے ہو وہ کرو۔ باقی دیکھا جائے گا۔ زندگی اس سے بدتر تو بہرحال نہیں ہو گی جیسی میں گزار تی ہوں۔ باقی سب کچھ تو سہا جا سکتا ہے۔"

امامہ کو اس وقت یہ بات کرتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ جن مشکلات سے سالار خوف زدہ تھا یہ وہ مشکلات نہیں تھیں جن کا وہ سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی' وہ صرف مالی مسائل کے حوالے سے اسے متنبہ کر رہا تھا۔

"میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے دنیا کی ہر نعمت ملی۔ روپیہ پیسہ کے بارے میں کبھی سوچنا نہیں پڑا۔ وہ وقت گزر گیا پھر ایک وقت آیا جب اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔ دوسروں کے سر پر محتاجی کی زندگی گزارنی پڑی۔ نوکری کرنا پڑی۔ ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن اپنی خواہشات اور آسائشات والی زندگی نہیں رہی تھی۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ پھر تمہارے ساتھ گزرے پچھلے سات سال میں دنیا کی ہر نعمت' ہر آسائش ملی۔ پہلے سے بڑھ کر' پہلے سے بہتر۔ میری توقعات اور سوچ سے بھی زیادہ۔ لیکن میں یہ بھی نہیں بھولی کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ نہ بھی ہوں مل جاتی ہیں صرف انسان ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ نہیں ملتے۔" وہ بات کرتے ہوئے رنجیدہ ہوئی تھی۔ "تو جب تک بچے اور تم میرے پاس ہو باقی کسی چیز کی پروا نہیں ہے مجھے۔ کم زیادہ۔ میں سب میں گزارہ کر سکتی ہوں۔"

اس نے سالار کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اسے ہولانا نہیں چاہتا تھا یہ کہہ کر وہ اور بچے بھی کبھی اس سے چھن سکتے تھے۔ جیسے اس سے چھین لیے گئے تھے۔ اور ہر آزمائش مال سے شروع ہو کر مال پر ختم نہیں ہو جاتی۔ لیکن وہ امامہ سے ابھی کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج کا تناؤ بھرا دن اسے دینے کے بعد وہ اسے مزید کسی خدشے اور اندیشے میں مبتلا کر کے اس کو رات بھی سولی پر لٹکا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"تم یہ سب کیسے کرو گے؟ کسی کے ساتھ مل کر؟" امامہ نے بالآخر ذہن میں ابھرنے والا وہ سوال اس سے پوچھا جو اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جواب عجیب مسکراہٹ کے ساتھ آیا تھا اور بے چارگی والی ایک کیفیت کے ساتھ بھی۔ اور وہ ایک بار پھر اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن اسے یقین تھا۔ سالار سکندر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں اتنا لاعلم نہیں تھا جتنا اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

"یہ کہو نا کہ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"بتانے کا فائدہ نہیں۔ کم از کم اس اسٹیج پر جب ہر نکتہ صرف ایک خیال اور سوچ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

سالار نے کہا اور بات کرتے ہوئے پہلی بار اس کی نظر امامہ کے ہاتھ میں پہنی اس انگوٹھی پر پڑی تھی جو اس نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کچھ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد آج اتنے ہفتوں بعد وہ پہلی بار اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے جسم پر کوئی زیور دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ انگوٹھی بھی اس گھر میں موجود لاکر میں پڑے دوسرے زیورات کے ساتھ جل گئی تھی اس آتشزدگی میں اور اب اس جگمگاتی بیش قیمت

انگوٹھی کو اس کی مخروطی انگلی میں سجا دیکھ کر سالار سکندر کو ایک عجیب خوشی ہوئی تھی۔ ناقابل بیان خوشی۔ اس نے امامہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کہاں سے آئی؟" گفتگو کا موضوع عجیب انداز میں بدلا تھا۔

امامہ ہنسی اور اس نے اس کی ہتھیلی پر ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ بڑے جتانے والے انداز میں۔ اسے سالار کی خوشی اور کیفیت کا اندازہ تو نہیں ہوا تھا لیکن خود وہ اس انگوٹھی کو دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔ اس گھر میں ضائع ہو جانے والے تمام زیورات میں اگر اسے کسی زیور کا غم تھا تو وہ یہ انگوٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ دیر سے ملا تھا لیکن منہ دکھائی کا تحفہ تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں جب جب وہ پہنی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ دیکھنے والے کو اپنی خوب صورتی سے مبہوت کر دیتی تھی۔ امامہ اس کی قدر تو جانتی تھی لیکن اس کی قیمت کا اندازہ آج بھی نہیں تھا۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ وہ بیش قیمت تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی فنکشن میں اسے پہن کر گئی ہو اور کسی نہ کسی نے اسے سراہا نہ ہو۔ اسے داد نہ دی ہو اور اس انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو۔ اس کا کھو جانا امامہ کے لیے عجیب کسک کا باعث بنا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ہاتھ میں نہیں پہنے رکھتی تھی، کبھی پہنے رکھتی تھی۔ کبھی اتار دیتی تھی لیکن وہ جب بھی گھر میں زیور اتارتی تھی تو اسے لاکر میں ہی رکھتی تھی۔ یہ سالار کی ہدایت تھی۔ یہ کا کو تھا۔ ان کے ملازمین قابل اعتماد اور ایمان دار تھے اور چھان پھٹک کر رکھے گئے تھے، لیکن وہ بے حد غریب تھے اور وہ زیورات کی شکل میں ان کے سامنے ترغیبات چھوڑ کر ان کو آزما کر نقصان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

حمین کی پیدائش کے بعد سالار کے واپس کا کو آنے پر امامہ کو پہلی بار اس انگوٹھی کا خیال آیا تھا، جب اسے بالآخر یہ پتا چل گیا تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا۔ اب کچھ جل گیا ہے یا لوٹ لیا گیا ہے۔ امریکن ایمبیسی کے اسپتال میں قیام کے دوران امامہ کو یہ یاد نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار وہ انگوٹھی کب اتاری تھی۔ اس نے آخری بار اپنے گلے میں پہنی ہوئی چین کب اتاری تھی۔ اپنے بندے کب اتارے تھے۔ اس کا خیال تھا یہ کام اس نے اسپتال چیک اپ کے لیے جانے سے پہلے کیا تھا۔ لیکن صرف خیال تھا اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور وہ اس کی وجہ اینستھیزیا کو سمجھتی تھی جو اسے سرجری کے لیے دیا گیا تھا لیکن جو اس کی یادداشت کو گڑبڑانے کا باعث بن رہا تھا۔

لیکن آج سالار سکندر کے آنے سے دو گھنٹے پہلے پاکستان کے لیے پیکنگ کرتے ہوئے اس نے اپنا ہینڈ بیگ تبدیل کرنے کے لیے اس میں سے چیزیں نکال کر ایک نئے ہینڈ بیگ میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ وہ ہینڈ بیگ تھا جو اسپتال جانے سے لے کر اب تک اس کے زیر استعمال تھا اور اب کچھ دن پہلے بازار سے ایک ہینڈ بیگ خرید کر وہ پرانے ہینڈ بیگ کے اندر موجود چھوٹی بڑی بہت ساری جیبوں کو کھنگال رہی تھی اور ان ہی چھوٹی بڑی جیبوں میں سے ایک جیب کے اندر وہ چھوٹا سا پاؤچ نکلا تھا اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی چند لمحوں کے لیے امامہ کی سانس ہی رک گئی تھی۔ ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر موجود زیور سرجری کے لیے تیار ہوتے ہوئے اتار کر اس بیگ میں رکھا تھا اور پھر یہ بیگ پیڈی کو دے دیا تھا اور ان تمام ہفتوں میں اس بیگ کو اس نے کئی بار ضرور "کھولا تھا لیکن کبھی بھی اس نے اسے کھنگالا نہیں تھا۔ شاید کھنگال لیتی اگر اس کی زندگی نارمل حالات سے گزر رہی ہوتی۔

ہاتھ سے پاؤچ کو ٹٹولتے ہوئے اس کے دل کی ——— دھڑکن خوشی سے بڑھی تھی اس کے اندر زیور تھا اور انگوٹھی بھی۔ وہ اس پورے دن کی ذہنی اذیت کو منٹوں میں غائب کر دینے والی خوشی تھی جو اس نے اس پاؤچ کو کھول کر اپنے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو لے کر اس نے جو چیز محسوس کی تھی۔ اور وہ پیڈی کی ایمان داری بھی تھی

جس نے کئی دن اس بیگ کو اپنے پاس رکھنے کے باوجود اسے ایک امانت کی طرح کسی خیانت کے بغیر امامہ کو لوٹایا تھا۔

وہ شکر کا ایک اور لمحہ تھا امامہ کے لیے جس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں دوبارہ پہنا تھا پھر سونے کی چین کو اور پھر ان کانوں کے بندوں کو اور وہ یہ سرپرائز سالار کو دینے سے پہلے ہی بھول گئی تھی اور اب سالار نے اس کے ایئر رنگز اس کی چین کو نوٹس نہیں کیا تھا اور وہ اس انگوٹھی پر اٹک گیا تھا۔

"تم نے میرے ایئر رنگز اور چین نہیں دیکھی۔" وہ اب اسے وہ دونوں چیزیں بھی ہاتھ سے چھوتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ کسی بچے کی طرح خوشی اور جوش سے اپنا کھویا ہوا کھلونا واپس اور غیر متوقع طور پر مل جانے پر۔

سالار نے مسکراتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھا اور پھر امامہ کے یک دم سب کچھ بھول بھال کر جگمگانے والے چہرے پر نظر ڈالی تینوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ چین ڈاکٹر سبط علی کی دی ہوئی تھی' وہ ایئر رنگز امامہ کو شادی کے تحائف میں اس کے سسر نے دیے تھے اور وہ انگوٹھی جو اس نے اسے دی تھی وہ؟ سکندر عثمان کی طرف سے جائیداد میں ملنے والے ایک پلاٹ کو بیچ کر خریدی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی چیز سود اور حرام کے پیسے سے نہیں خریدی گئی تھی اور وہ سالار کی طرف سے ملنے والا واحد زیور تھا جو اس کی اپنی آمدنی سے نہیں خریدا گیا تھا۔ اور وہ زیور واپس آگیا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" امامہ نے اسے مخاطب کیا' وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے چھوتے ہوئے جیسے چونکا تھا اپنی گہری سوچ سے۔ کچھ حقائق اور ان کا ادراک ایسا شرمسار اور نادم کرنے والا ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی انہیں کسی کے سامنے دہرا نہیں سکتا' وہ بھی اس وقت ایک بار پھر اسی لمحہ سے گزرا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی کچھ خیال آیا تھا۔" سالار گہرا سانس لے کر بات ٹال گیا تھا۔

"اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟" پتا نہیں امامہ کو یک دم اس کی قیمت پوچھنے کا خیال کیوں آیا تھا۔

"یہ انمول ہے کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" سالار نے اس کا ہاتھ چوما تھا اور وہی جواب دیا تھا جو پہلی بار اس انگوٹھی کو پہناتے ہوئے دیا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح سرشار ہوئی تھی۔ یہ بہت دفعہ پیش کیا جانے والا "خراج تحسین" تھا لیکن ہمیشہ نیا لگتا تھا کیونکہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ یہ وہ سالار سکندر نہیں رہا تھا جو امامہ ہاشم کو سمجھ نہیں پاتا تھا اور اسے امامہ کی دل جوئی کرنے نہیں آتی تھی۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد وہ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

"پیکنگ مکمل ہو گئی۔" سالار نے داد دینے کے ساتھ ہی اگلے کسی جملے سے بچنے کے لیے بات کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں مکمل ہو گئی۔" امامہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تین دن کے بعد وہ پاکستان جا رہے تھے۔

"پیکنگ کی ہی کیا اس بار۔ سب کچھ تو گھر میں ہی جل گیا۔ بس بچوں کی ضروری چیزیں ہیں جو خرید کر لائی ہوں یا اپنے کچھ کپڑے۔"

"تم کتنے دنوں کے لیے ٹھہرو گے وہاں؟" امامہ نے بات کرتے کرتے اس سے پوچھا۔

"ایک ہفتہ۔" سالار نے بستر پر لیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"کیوں؟ تم ہمارے ساتھ وہاں زیادہ دن کیوں نہیں ٹھہرو گے؟" امامہ کو اعتراض ہوا۔

"ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ ہے میرے لیے۔ کام کا ڈھیر ہے یہاں اور مجھے تمہارے واپس آنے سے پہلے گھر کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہفتے کے بعد ہی واپس آجاؤں گی۔" امامہ نے کہا۔
"نہیں تم اب ایک ماہ کے بعد ہی واپس آؤ، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ وہاں گھر کا ماحول تبدیل ہوگا تو تم بہتر محسوس کروگی۔ یہاں بچوں کے ساتھ بہت پریشانی ہوتی ہے تمہیں۔" سالار نے اسے کہا تھا۔
"مجھے بچوں سے زیادہ تمہاری پریشانی ہوتی ہے۔" وہ ایک بار پھر وارڈروب کے سامنے کھڑی تھی۔ سالار نے بستر پر لیٹے لیٹے اسے دیکھا۔ وہ وارڈروب سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز میں کچھ تھا جس نے سالار کو چونکایا تھا۔
"میری کیا پریشانی؟" اس نے پوچھا تھا۔
"پتا نہیں، تم سے مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس نے تو جیسے بات کرکے وارڈروب دوبارہ کھول لی اور ایک بار پھر ایسے انداز میں کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔
"کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟" سالار نے اسی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا امامہ نے ویسے ہی کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا "کس چیز سے ڈر لگتا ہوگا مجھے؟" وہ جیسے کسی سائیکاٹرسٹ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھ رہی تھی۔
"میری موت سے۔" اور وہ سائیکاٹرسٹ بے حد بے رحم تھا۔
امامہ ہل نہیں سکی اس نے جیسے نشتر اس کے جسم میں موجود ناسور کے اوپر سیدھا ہی مار دیا تھا۔ اس نے کتنے آرام سے جیسے پہیلی بوجھ لی تھی۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اب اس کے پاس کہنے کے لیے بوجھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔
"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" سالار اس کی نظروں سے جیسے الجھا تھا۔
"تم بہت بے رحم ہو اور ہمیشہ سے ہو۔"
"تم نے سوال کیا تھا مجھ سے۔۔۔ میں نے تو صرف اندازہ لگایا۔۔۔ صحیح اندازہ لگایا ہے کیا؟" وہ جیسے داد چاہتا تھا۔
"اب تمہیں پتا چلا میں تم سے کیوں کہتی ہوں کہ تمہارے اندر آج بھی موت کشش رکھتی ہے۔" وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ نہیں کہہ سکی اور جو کہہ رہی تھی اس کے غلط ہونے کا اسے اندازہ ہو گیا تھا۔
"موت سے کون ایسی نیت ہوتا ہے امامہ؟ کوئی پاگل ہی ہوگا جو ایسا سوچے گا اور ایک وقت میں میں پاگل تھا ۔۔۔ اب نہیں ہوں۔" وہ عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
"اب بھی ہو۔" امامہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہنسا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔
"You are always right"۔ (تم ہمیشہ ٹھیک کہتی ہو)
اس کی ہنسی نے امامہ کو کم تپایا تھا اس کے جملے نے زیادہ۔۔۔ وہ وارڈروب کو پوری قوت سے بند کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اسے زچ کرے گا اور کرتا ہی جائے گا، یہ اس کا ذہنی تھکن اتارنے کا ایک طریقہ تھا۔ اسے زچ کرنا۔ اور وہ اس وقت اپنا دماغ خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

کانگو کا بحران اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات سی آئی اے کے لیے سالار سکندر کو اس لسٹ میں ڈالنے کا باعث بنا تھا جن پر باقاعدہ نظر رکھی جاتی تھی، وہ افریقہ میں اب ان کا (Key figure) سب سے اہم کارندہ تھا ان کے لیے کام کر رہا تھا لیکن ان کا ساتھی نہیں تھا۔ ان کے پے رول پر بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بار ایک عجیب و غریب کام میں حصہ دار بنے تھے shadow work partner دونوں ایک دوسرے سے بھی واقف تھے،

ایک دوسرے کے نام سے بھی اور ایک دوسرے کے کام سے بھی۔ اس بات سے بھی کہ دوسرا اس بات سے واقف تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے' مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ورلڈ بینک کی طرف سے بھیجی جانے والی ٹاپ پروفیشنلز کی ٹیم بھی سی آئی اے کے انڈر کور ایجنٹس کی ہے اور ——— دونوں پارٹنرز اپنے سائے کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود اپنا کام کر رہے تھے۔ اور کوئی کسی کو دھوکا دیے بغیر ایک دوسرے کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ سی آئی اے سالار سکندر کی سیکیورٹی اور افریقہ میں ورلڈ بینک کے پروجیکٹس کو کامیاب بنانے کی ذمہ دار۔ تھی اور وہ اس رول کو بخوبی انجام دے رہے تھے۔ سالار سکندر' ورلڈ بینک امریکی حکومت اور سی آئی اے کے لیے نعمت مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے کانگو اور افریقہ میں ایک بہت نازک صورت حال میں ان سب کو ایک بے حد شرم ناک اور خطرناک صورت حال سے نکالا تھا اور بے حد خوبی اور مہارت سے۔ اس کی تقریر میں اپنے ہی ادارے کی اور سامراجی قوتوں پر کی جانے والی تنقید کسی کو بری نہیں لگی تھی۔ اگر صورت حال کنٹرول میں آجاتی تو وہ اس سے زیادہ گالیاں کھانے پر تیار تھے۔ لیکن اگر کوئی چیز سالار سکندر کی تقریر میں انہیں قابل اعتراض لگی تھی تو وہ اپنے مذہب اور پیغمبر کا حوالہ تھا۔ اس نے دین کو آدمیت اور انسانیت کے سیکولر لبادے میں ملفوف کر کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے دین اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ذکر کیا تھا اور سالار سکندر ہمیشہ ایک لبرل سوچ رکھنے والا مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس کی ایک پبلک اسپیچ میں جھلکنے والی مذہبی "انتہا پرستی" ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے کو بھی قابل اعتراض لگی تھی۔

وہ افریقہ میں بے شک ان کے لیے سب سے اہم تھا لیکن کوئی اہم ترین شخص بھی "اسلامی سوچ" کے پرچار کے لیے ورلڈ بینک کا عہدہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نارمل حالات ہوتے تو وہ تقریر سالار سکندر سے استعفے کے لیے بے حد مضبوط وجہ تھی لیکن یہ نارمل حالات نہیں تھے۔ ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے نے بھی سالار سکندر کی اس تقریر سے نظریں چرا کر بظاہر اس کی پردہ پوشی کی تھی لیکن درپردہ میڈیا میں اپنے صحافیوں کے ذریعے سالار سکندر کو اس تقریر میں مذہبی حوالہ دینے کے لیے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ سلسلہ براہ راست کوریج کے فوراً بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ امریکہ اور سی آئی اے کو کانگو اور افریقہ میں ہرکارہ چاہیے تھا۔ مسیحا اور لیڈر نہیں۔ وہ ہر شخص کو اس کی اوقات میں رکھنا جانتے تھے اور اب اس پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ چینلز پر سالار سکندر کی اس تقریر کو موضوع بحث لانے والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے بہت سے دوسرے پوائنٹس کو بھی زیر بحث لانا شروع کر دیا تھا۔ ایک نئی چیخ و پکار سالار سکندر کی مذہبی شناخت مذہبی اعتقادات اور اعمال کے حوالے سے شروع کر دی گئی تھی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ایک بنیادی حصہ سود کے خلاف ان کے احکامات بھی تھے جنہیں مغربی میڈیا نے بہت نمایاں انداز میں پیش کیا تھا کیونکہ وہ انہیں مغربی نظام معیشت کی بنیادوں کو چیلنج کرنے والی سوچ اور فلاسفی لگی تھی' وہ یہ بات علی الاعلان نہیں کہہ رہے تھے کہ وہ مغربی نہیں۔ یہ سودی نظام معیشت کو چیلنج کرنے والی فلاسفی تھی۔

سالار سکندر کے خلاف مغربی میڈیا میں اٹھنے والا یہ طوفان اسے افریقہ میں اور مشہور کر رہا تھا۔ اور سالار سکندر نے مغربی میڈیا پر اپنی اس تقریر کے حوالے سے کوئی وضاحتیں۔ صفائیاں اور معذرتیں پیش نہیں کی تھیں۔ اس کے آفس کا خیال تھا کہ اس تقریر کے اقتباسات کو کچھ بگاڑ کر کے نئے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا جائے

سالار نے کسی بہانے' معذرت' وضاحت اور سیاق و سباق کو اپنی اس تقریر کے لیے پیش کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے آفس نے دو دن بعد ایک سطری بیان جاری کیا تھا کہ سالار سکندر اپنی اس تقریر کے ہر جملے اور لفظ پر یقین رکھتے ہوئے اس کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اسے مکمل طور پر قبول کرتے ہیں۔"

پر جیسے اس مہینا کے منہ پر مارا جانے والا طمانچہ تھا جو اس کی طرف سے اس تنقید کے بعد کی وضاحتی بیان اور سدورے کا منتظر تھا۔

وہ ورلڈ بینک کا پہلا بنیاد پرست نائب صدر قرار دیا گیا تھا۔ سی آئی اے کو سالار سکندر کو مانیٹر کرتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کی بات کر رہا تھا جو سود سے پاک ہوتا۔ ان کے لیے پریشان کن بات نہیں تھی۔ سالار سکندر ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہتے ہوئے عملی طور پر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ اور جو خواب وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کو وہ ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے اگر کوئی بات پریشان کن تھی تو وہ سالار سکندر کا یہ یکدم سامنے آنے والا مذہبی تشخص تھا جو ان کے نزدیک افریقہ جیسی حساس جگہ پر ان کے لیے پریشانیاں کھڑی کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ ضروری ہو گیا تھا کہ سالار سکندر کو صرف افریقہ ہی میں نہیں' ہر جگہ ہی مانیٹر کیا جائے اور سی آئی اے نے یہی کیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں سی آئی اے کے ریکارڈز کا حصہ بن رہی تھیں۔ اور پہلی غیر معمولی سرگرمی جو سی آئی اے نے ریکارڈ کی تھی وہ اس کی تدفین کے تین ہفتے بعد مسقط میں سالار سکندر کی سمندر میں ایک لانچ پر پانچ لوگوں سے ایک ملاقات تھی' جس میں سے ایک مسقط کی رائل فیملی سے تھا۔ بظاہر اس ملاقات کو ایک گیٹ ٹوگیدر سمجھا جا سکتا تھا۔ سالار سمیت وہ پانچوں پرانے شناسا اور دوست تھے۔ ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ مختلف قومیتوں اور پروفیشنز سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ تھے اور ان میں سے کسی کا بھی کانگو اور افریقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے سالار سکندر کے۔ نہ کانگو اور افریقہ سے تعلق تھا نہ ہی ورلڈ بینک سے لیکن اس کے باوجود ان سب میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔ وہ سب سالار سکندر کے ہم عمر تھے۔ صرف ایک شخص مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کے علاوہ باقی سب مختلف قومیت رکھنے کے باوجود امریکن شہریت رکھتے تھے اور مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا شخص بھی اس وقت امریکہ ہی میں مقیم تھا۔ وہ سب دنیا کے 100 ٹاپ 40 گلوبل لیڈرز کی فہرست میں شامل تھے جن کے بارے میں یہ پیش گوئی تھی کہ وہ دس سال بعد دنیا کے ممتاز ترین لیڈرز میں سے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی بات سی آئی اے کے لیے پریشان یا تشویش کن نہیں تھی سوائے ایک آخری مماثلت کے' سالار سمیت وہ پانچ کے پانچ افراد مسلمان تھے۔ اور باعمل مسلمان تھے اور قرآن پاک کے حافظ تھے۔

☼ ☼ ☼

یہ پاکستان میں لیلہ کے قیام کا تیسرا ہفتہ تھا۔ وہ شروع کے دو ہفتے لاہور میں ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں کے پاس گزار کر اب پچھلے دو ہفتے اسلام آباد رہنے آئی تھی۔ زندگی اب یوں بھاگم دوڑ میں گزر رہی تھی کہ اسے اس "پرابوالے گھر" کو دیکھ کر بار بار اداس ہونا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ امامہ جانتی تھی اور اس کے کشادہ لان پر اب مزید تعمیرات ہو چکی تھیں۔ گھر کا نقشہ بھی کچھ کا کچھ کر دیا تھا اس کے نئے مکینوں نے۔ اور اب سکندر عثمان کے گھر سے شاپنگ کے لیے بار بار باہر آتے جاتے اس گھر کو دیکھ کر وہ نظریں چرا لیتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی' نہ ماضی کے اس حصے میں دوبارہ جانا چاہتی تھی جو کسی دلدل کی طرح اسے اندر ہی اندر کھینچنے لگتا تھا۔ اور نظریں چرانا آسان ان تین نعمتوں کی وجہ سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھیں۔ جبریل' عنایہ اور حمین نے جیسے اس کی زندگی کو ماضی سے نکال کر مستقبل میں بھیج دیا تھا۔ ان کے وجود سے وابستہ مصروفیات نے اس کی زندگی کی رفتار کو بے حد تیز کر دیا تھا۔ سوچنے اور یادوں میں بھٹکنے کا وقت نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اور یہ بھی جیسے ایک نعمت تھی اس کے لیے۔

سکندر عثمان اور طیبہ اب وہاں اکیلے رہتے تھے۔ طیبہ وقتاً" فوقتاً" اپنے سب بیٹوں کے پاس دوسرے ملکوں میں آتی جاتی رہتی تھیں لیکن ان کا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں ہی گزرتا تھا۔ امامہ اور اس کے بچوں نے سکندر عثمان اور ان کی روٹین کی زندگی کو اسی طرح توڑا تھا جیسے ان کے باقی بچوں کا اپنی فیملیز کے ساتھ آنا توڑتا تھا۔

سالار پاکستان امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ ان کی فلائٹ اسلام آباد ہی کی تھی۔ دو تین دن امامہ اس کے ساتھ وہاں رہتی پھر اس کے ساتھ لاہور چلی جاتی اور پھر وہاں سعیدہ اماں اور ڈاکٹر سبط علی کے پاس چند دن گزار کر واپس اسلام آباد آجاتی اور پھر وہیں سے واپس کانگو چلا جانا تھا اسے۔

وہ وہاں ان کی آمد کا دوسرا دن تھا جب سالار نے اسے امریکہ میں اپنے کسی پرانے دوست کے بارے میں بتایا تھا جو اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان میں مقیم تھا اور سالار سکندر سے ملنا چاہتا تھا' اسے مبارک باد دینے کے لیے...

سالار اپنے پرسنل وزٹ پر تھا لیکن اس ایک ہفتے میں بھی اسے مسلسل بہت سے سرکاری عہدے داران اور احباب سے ملنا تھا جو اس کو ورلڈ بینک کی نائب صدارت سنبھالنے پر ابھی تک ذاتی طور پر مل کر مبارکباد نہیں دے سکے تھے۔

کئی سالوں بعد سعد اپنی فیملی کے ساتھ سالار سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور سالار فوری طور پر اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ وہ مکمل طور پر باریش تھا۔ اور اس کی داڑھی اسی فی صد سفید ہو چکی تھی جسے رنگنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ وہ بے حد مہنگے برانڈڈ شلوار قمیض میں ملبوس تھا لیکن شلوار اس کے ٹخنوں سے اوپر تھی۔ وہ فربہی مائل تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور ایکسرسائز سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ نقاب لیے ہوئے اس کی بیوی' ایک آٹھ سالہ بچہ اور دو چھوٹی بچیاں تھیں۔

وہ لوگ اس کی بیوی سالار اور امامہ سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ امامہ جانتی تھی سعد سالار کے شناساؤں میں سے تھا' قریبی دوستوں میں سے نہیں' لیکن اس کے باوجود سعد اپنی گپ شپ اور بلند وبانگ قہقہوں کے دوران سالار کے اس کے ساتھ امریکہ میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایسے ایسے قصے نکال کر سناتا رہا جیسے وہ اور سالار بہترین اور بے حد گہرے دوست رہے تھے۔ یار غار قسم کے دوست۔

"مجھے تو ہمیشہ سے ہی اندازہ تھا کہ سالار بڑی ترقی کرنے والا تھا بس ذرا قبلہ خراب تھا اس کا۔ وہ میں کھینچ کھینچ کر ٹھیک کرتا رہتا تھا۔"

چائے پینے کے دوران اس نے امامہ پر جیسے ایک انکشاف کیا۔ سالار اور امامہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔

"اور اب دیکھیں بھابھی کیسا بدلا ہے؟ میری کوششیں کیسا رنگ لائی ہیں۔" سعد کہہ رہا تھا سالار نے اپنا کپ رکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔ میری کوششیں کوئی رنگ نہیں لا سکیں' اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔" سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سعد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"ارے ہم پر کہاں کسی کا رنگ چڑھنا تھا۔ ہم پر تو اپنا ہی رنگ بڑا پکا تھا۔ بھابھی یہ آپ کا شوہر نائٹ کلبز اور ڈسکوز کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے بھی کھینچ کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نت نئی لڑکیوں سے دوستی تھی اس کی۔ بڑی رنگین زندگی گزاری ہے اس نے۔"

سالار نے سعد کے بارے میں ٹھیک کہا تھا وہ نہیں بدلا تھا۔ چند لوگ خود کو بہترین مسلمان ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ہر عیب اور خامی کو دکھانے اور جتانے کی وبا میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا اسلام انہیں صرف مقابلہ اور موازنہ سکھاتا ہے۔ پردہ پوشی نہیں۔ وہ کسی انسان کے حال اور کامیابیوں پر اسے مبارک باد تو دے

سکتے ہیں اس پر رشک بھی کرسکتے ہیں۔ اسے اپنا دوست کہنے پر فخر بھی کرسکتے ہیں لیکن اس کے ماضی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھلائے بغیر۔ دل آزاری اور دل شکنی ان کے اسلامی گناہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ سعد بھی یہی کر رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کتنے "نیک مسلمان" تھے کہ جو دنیاوی کامیابیوں میں سالار سکندر سے پیچھے ہوسکتا تھا لیکن مومن تھا اور روحانی، ذہنی اور اخلاقی طور پر اس سے بے حد بہتر تھا۔

احساس کمتری کی یہ ایک بے حد بھیانک شکل ہوتی ہے، جس میں کوئی شخص یہ بھی طے نہیں کرپاتا کہ اسے دوست کے ساتھ دوستی کرنی ہے یا دشمنی۔

سعد اب اپنے انکشاف سے جیسے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے اپنی پلیٹ میں ایک نیا کباب لیتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ امامہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ بہت سے انکشافات کسی کے لیے بھی بے تاثر اور بے اثر نہیں ہوسکتے۔ بھی جب کوئی انکشاف اس طرح کھلے عام اتنے توہین آمیز انداز میں کیا گیا ہو۔

"بھابھی! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعد۔ میری کافی رنگ برنگی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن سعد کو صرف ایک ہی رنگ کی لڑکی پسند تھی اور میں ذرا شوقین مزاج تھا۔ ڈسکوز اور نائٹ کلبز آتا جاتا رہتا تھا ان لڑکیوں کے ساتھ لیکن سعد ظاہر ہے میرے جیسا شوقین مزاج نہیں تھا اس لیے وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر پر ہی رہنا پسند کرتا تھا۔"

کباب تو سعد نے پلیٹ میں رکھ لیا تھا لیکن پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے ہی بچی تھی۔ سالار سکندر نے کئی سالوں کے بعد ایسی کم ظرفی اور بے لحاظی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کا ایک زمانے میں شناختی نشان تھا اور اسے سعد کے تین کم سن بچوں اور بیوی کے سامنے اس گھٹیا پن کا مظاہرہ کرنے پر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن سعد کے کسی اور ممکنہ تمغۂ امتیاز کو اپنے سینے پر سجانے سے روکنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی حفاظتی اقدام کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا۔ ہاں اسٹیفنی۔ اب تو ٹھیک ٹھاک سی رہ گئی ہوگی یاد وہ بھی نہیں ہے؟" اس کی یادداشت سفاکانہ حد تک تیز تھی اور اس وقت اس نے سعد کا قتل ہی کردیا تھا۔ سعد کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ سالار یک دم اس طرح گفتگو کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی بار یا پارک میں اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس کسی دوسرے شخص کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس سب کی ابتدا سعد نے کی تھی لیکن انتخاب سالار کر رہا تھا۔ سعد جواب کیا دیتا؟ اس کا تو سانس لینا بھی محال ہوگیا تھا۔

امامہ اس کی بیوی کے تاثرات دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا لیکن اس کی آنکھیں یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ سالار کے انکشافات سے خوش نہیں ہوئی تھی۔ خود امامہ کو بھی سالار کا یہ جوابی وار کچھ زیادہ نہیں بھایا تھا۔

"بھابھی! آپ کچھ لیں۔" اس نے صورت حال کو سنبھالنے کی بروقت کوشش کرتے ہوئے سعد کی بیوی عالیہ کی توجہ اس گفتگو سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں، بچے اور یہ لے رہے ہیں بس کافی ہے۔ ہم کچھ دیر پہلے ہی کسی لنچ سے آئے ہیں تو مجھے بالکل طلب نہیں ہے۔"

امامہ کو عالیہ کا لہجہ بے حد کھردرا لگا تھا۔ سعد کی طرح باتونی نہیں تھی یا پھر شاید سالار کے وہاں بیٹھے ہونے کی وجہ سے اور سعد کے اس بے مسلسل باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

"آپ تو ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتیں نا؟" کیا سوال تھا جو سعد کی بیوی کی زبان سے امامہ کے لیے نکلا تھا۔

کمرے میں یک دم خاموشی نہیں سکتہ چھایا تھا۔ وہ تجسس نہیں تھا' جوابی وار تھا۔ سعد سے نہیں آیا تھا اس بار اس کی بیوی سے آیا تھا۔

"نہیں الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر امامہ نے بے حد مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ بعض لاحقے کبھی سابقے نہیں بنتے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی حصہ تھا اس کی زندگی کا۔ جس کا تعارف اس کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

"اوہ اچھا۔ مجھے انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔" وہ اسی بے نیازی سے سعد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ "تو بھابی! آپ پھر کوئی ادارہ جوائن کریں نا۔ آپ کو تو بہت زیادہ اصلاح اور علم کی ضرورت ہوگی جب تک آپ پاکستان میں ہیں "آپ میرے ساتھ ایک مدرسے میں چلیں۔ وہاں درس قرآن بھی ہوتا ہے اور آپ کی روحانی اور اخلاقی تربیت۔"

"آپ کا بہت شکریہ لیکن مجھے اسلام قبول کیے اور قادیانیت چھوڑے سولہ سترہ سال ہوچکے ہیں اور میں ایک حافظ قرآن کی بیوی ہوں۔" امامہ نے اس کی بات بڑی نرمی سے کاٹی تھی۔

"وہ تو میں بھی ہوں۔" عالیہ نے اسی انداز میں کہا "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں پڑا ہوگا مجھے پڑا ہے۔"

"بھابی! آپ کو اس حوالے سے جب بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے ہم حاضر ہیں۔ اب میل جول تو ہوتا ہی رہے گا۔ میں ان شاء اللہ اس سال وقت نکال کر تبلیغ کے لیے کچھ دنوں کے لیے کانگو بھی آؤں گا تو آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی اچھا رہے گا اگر ہمارے بچے آپس میں ملتے جلتے رہیں۔" سعد نے اپنی طرف سے بروقت موقع پر مداخلت کرتے ہوئے گفتگو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"جی بھابی! ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔ ہمارے بچوں کو آپس میں ملتے رہنا چاہیے اور ہمیں بھی۔ بہت سی چیزوں میں آپ کو اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔" عالیہ نے اپنے شوہر کی گفتگو کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تو میں اور امامہ ضرور آپ سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے لیکن فی الحال مجھے لگتا ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔"

اس بار سالار نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے جیسے ایک فل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"یار! بچے کہاں ہیں تمہارے؟ تم ان سے تو ملواتے میں چاہ رہا تھا احسن اور جبریل بھی آپس میں متعارف ہو جاتے۔"

سعد سالار کو کم از کم اس حد تک ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے لہجے کی بے رخی اور بے اعتنائی کو پہچان لیتا اور وہ اس نے پہچان لی تھی اور ایک بار پھر اس نے بات بدل کر ماحول کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جی جی ضرور' بچے ابھی لا ہی رہا ہوگا ملازم۔ سامنے لان میں کھیل رہے تھے۔" امامہ نے سعد کی اس کوشش کو کامیاب کرنے میں ساتھ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہاں کوئی اور بات ہوتی۔ ملازم کے ساتھ عنایہ اور جبریل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سعد نے بڑی گرم جوشی سے ان دونوں کو پیار کیا تھا پھر جبریل اور احسن کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ چار ساڑھے چار کا جبریل اور سات آٹھ سال کے احسن سعد کی وہ پہلی ملاقات تھی لیکن وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔

وہ دونوں ایک جیسے تھے۔ مزاجاً "کم گو" ریزروڈ بہت تمیزدار۔ جبریل احسن سے عمر میں بہت چھوٹا ہونے کے باوجود اچھا قد کاٹھ رکھتا تھا اور دیکھنے میں ان کے درمیان عمر کا فرق اتنا نمایاں نہیں تھا۔ چھ سالہ آسیہ اور چار سالہ

مووا حسن کی نسبت اتنی ریزروڈ نہیں تھیں۔
وہ لوگ آدھ گھنٹہ اور بیٹھے تھے اور پھر انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے تھے۔ وہ ایک یادگار اور خوشگوار ملاقات نہیں تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی ہر ملاقات ایسا ہی تاثر لیے ہوئے رہنے والی تھی۔

سعد اور عالیہ کے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اس ملاقات کے دوران ہونے والے انکشافات کو دہرایا تھا نہ ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی زندگی میں صرف شناساؤں کی کیٹیگری میں رہنے والے لوگ تھے۔ ان کا حلقہ احباب بننے والے نہیں تھے۔ انہیں اس وقت یہ اندازہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں خاندان ایک عجیب و غریب رشتے میں جڑنے والے تھے۔

☆ ☆ ☆

سالار ایک ہفتے کے بعد واپس کانگو چلا گیا تھا اور امامہ اسلام آباد سے لاہور سالار کے ساتھ آئی تھی پھر وہیں اگلے دو ہفتے رہی تھی۔ کچھ دن ڈاکٹر سبط علی کے پاس اور کچھ دن سعیدہ اماں کے پاس۔ جو ان ہی دنوں پاکستان آئی ہوئی تھیں۔
وہاں سے واپس اسلام آباد آنے پر امامہ اور بچوں کو سکندر عثمان اور طیبہ کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کو ملا تھا اور اس کے واپس جانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا، جب سکندر عثمان نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کو ہاشم مبین کے بارے میں بتایا تھا۔
"وہ کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تمہارا نمبر لینے کے لیے۔ یا تمہارا ایڈریس لینے کے لیے لیکن میں اتنی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کہ تمہارا اور ان کا رابطہ کرواتا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا تم پھر پریشان ہو۔"
سکندر عثمان اس سے کہہ رہے تھے۔
"لیکن مجھے لگا میں بہت زیادتی کروں گا تمہارے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔ اگر میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کروں۔"
وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"
"یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔" سکندر عثمان نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے پھندا لگا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا لیکن اسے تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کے ماں باپ بھی ہیں۔ زندگی کے سولہ سترہ سال اس نے ان کے بغیر گزارے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی۔ وہ آج بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ آج بھی ان کے بارے میں جذباتی تھی۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں نے سب بدل دیا تھا۔ وسیم کی موت نے۔ جبریل اور عنایہ اور حمین نے۔ اور سالار نے۔
"اب ملنے کا فائدہ نہیں ہے۔"
اس نے سر جھکا کر سکندر عثمان سے کہا اور اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ان سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے خاندان سے ملنے کے لیے منتیں ہی کرتی رہی تھی۔ انکار تو ہمیشہ دوسری طرف سے ہوتا تھا۔ آج پہلی دفعہ وہ انکار کر رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ بدلا تھا امامہ میں۔ یا پھر سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔
"ماں باپ کے بارے میں ہم فائدے اور نقصان بھی نہیں سوچتے۔ صرف حق اور فرض سوچتے ہیں۔"
سکندر عثمان نے ایک بار پھر بڑی رسانیت سے اس سے کہا تھا۔ انہوں نے اس بار بھی ٹھیک کہا تھا۔ سر جھکائے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر جیسے ماضی کو ایک فلم کے فلیش بیک کی طرح گزرتے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ

ظلم اتنی بار دیکھ چکی تھی کہ اب وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی' وہ اپنی یادداشت کے اس حصے کو ہی پیچھے کاٹ کر خود سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

"پاپا میں اب اس متعلق پل پر نہیں بھول سکتی۔ میرے بچے ہیں اب میں اپنی ذہنی الجھنیں ان تک منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت خوش اور پرسکون ہوں اپنی زندگی میں۔۔۔ بس ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ کسی نفرت، ملامت کا بوجھ میں نہیں اٹھا سکتی اب۔۔۔ کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے اب۔۔۔ جو گزر گیا، بس گزر گیا۔ میں واپس پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔"

وہ سکندر عثمان سے کہہ رہی تھی اور اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں کب برسنا شروع ہوئی تھیں۔

"امامہ! وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔" وہ چپ ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا ردعمل دے' خوش ہو؟ خوش تھی۔۔۔ رو پڑے؟ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کرے؟ وہ ہمیشہ کرتی رہتی تھی۔

"وہ مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی میں تمہیں کہتا تم ان سے مل لو۔ ہم سب بہت خامیوں والے انسان ہیں۔ غلطیاں گناہ سب کرتے رہتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی ہیں۔۔۔ کچھ خوبیوں میں اچھے۔۔۔ کچھ خامیوں میں برے۔۔۔ لیکن سب سے بہتر شاید وہ ہوتا ہے جو درگزر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔۔۔ اور بعض گناہوں کی سزا جب اللہ دے دیتا ہے تو پھر ہمیں نہیں دینی چاہیے۔"

سکندر عثمان نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ اس کے اندر کی کیفیت سے بے خبر تھے۔۔۔ ہوتے تو یہ سب نہ کہتے۔ سوال معافی کا تو تھا ہی نہیں۔۔۔ اولاد اور ماں باپ کا تعلق معافی پر تو کبھی کھڑا کیا ہی نہیں جا سکتا۔۔۔ گلے شکوے کا وقت بھی اب گزر چکا تھا۔۔۔ وہ ان کا سامنا اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اپنے وجود کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس نے بے حد مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا تھا۔۔۔ سالار کے لیے' اپنے بچوں کے لیے' اپنے گھر کے لیے۔

اس نے سکندر عثمان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ اگلے دن ہاشم مبین سے ملنے پر بھی تیار ہو گئی تھی لیکن وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ کچھ لوگوں کے روبرو ہونے کے لیے آپ ساری عمر ترستے رہتے ہیں اور پھر جب ان کا ہونا طے پا جاتا ہے تو سمجھ نہیں آتا انسان ان کا سامنا کرے گا کیسے۔

آج سے کچھ سال پہلے ہاشم مبین نے یہ کام کیا ہوتا تو اس وقت وہ ساتویں آسمان پر ہوتی۔ اپنے خاندان کو اپنے دین پر لے آنے' گمراہی کے راستے سے پلٹ آنے کے لیے اس نے بڑے سال دعائیں مانگی تھیں۔۔۔ اور اس خاندان کا معزول سربراہ اب جب تائب ہو گیا تھا تو امامہ اپنے دل کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

وہ اکیلے سہ پہر آئے تھے۔۔۔ وہ کمرے میں آئی تو باپ پر پہلی نظر ڈالتے ہی رو پڑی تھی نہ رونے کا تہیہ کیے ہوئے بھی۔۔۔ وہ بے حد ضعیف لگ رہے تھے۔۔۔ یہ تنتنے والا وہ وجود نہیں تھا جس سے وہ ساری عمر ڈرتی رہی تھی۔

ہاشم مبین نے اسے گلے لگایا تھا۔۔۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بھی بڑے حوصلے سے ان سے مل کر الگ ہوئی تھی' پہلے کی طرح۔۔۔ عادتاً" ان سے لپٹی نہیں رہی تھی اور پھر وہ آمنے سامنے دو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ وہ دونوں تھے اور طویل گہری خاموشی تھی۔۔۔ پھر اس خاموشی کو ہاشم مبین کی ہچکیوں اور سسکیوں نے توڑا تھا۔۔۔ وہ بوڑھا آدمی اب بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

امامہ انہیں چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی تھی' وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے برسنے والے آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپکتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"وقت واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے۔۔۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں نے بہت ظلم کیا اپنے آپ پہ۔ اپنے

خاندان پر۔ پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب کچھ؟"

ہاشم مبین روتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے اور امامہ کو یاد آیا تھا انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ جو چیز وہ کرنے جا رہی تھی وہ اس پر بہت پچھتائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور وہ واپس پلٹ کر ان سے معافی مانگنے آئے گی۔ اور تب وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ وقت واقعی بہت بے رحم اور ظالم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھ کر بچوں کی طرح روتا ہوا یہ بوڑھا شخص اس کا اپنا باپ تھا۔ وہ تو آج بہت فخر محسوس کرتی کہ اس کا سر نیچا نہیں ہوا تھا۔ کسی اور کا ہوا تھا پر سارا دکھ یہی تھا کہ اس کا باپ اپنے بیٹے کی سزا پا رہا تھا تو بھی تکلیف اسی کو ہو رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے امامہ! مجھے تمہاری بددعا لگ گئی۔" ہاشم مبین نے روتے ہوئے کہا۔

"مجھے کبھی بددعا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ابو۔ آپ کے لیے یا کسی کے لیے بھی۔"

اس نے بالآخر ہاشم مبین سے کہا تھا۔ وہ آج اس تنتنے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے تو وہ انہیں کہتی کہ انہیں اس کی بددعا نہیں لگی۔ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کی سزا ملی ہے۔ وہ رتبہ جو اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں عطا کیا تھا اس رتبے کو کسی اور کو دے دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا ان کا خاندان۔ وہ صرف قادیانی نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس مذہب کی تبلیغ بھی پوری جانفشانی سے کی تھی۔ پتا نہیں کتنوں کو گمراہ کیا تھا اور اس گمراہی کے بدلے میں کتنوں کی عاقبت خراب کی تھی ورنہ ان کے خاندان میں کبھی یہ تو نہیں ہوا تھا جو ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ کروڑپتی تھے اور ساری عمر آسائشوں میں گزارنے کے بعد وہ اپنا بڑھاپا اولڈ ہوم میں گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان میں پہلی بار کوئی ایسے بے گھر، بے در ہوا تھا۔ لیکن ان کے خاندان میں گمراہی کی روایت بھی ہاشم مبین ہی کی قائم کردہ تھی۔

"آپ نے دیر سے کیا لیکن صحیح اور اچھا فیصلہ کیا۔" یہ ایک جملہ کہتے ہوئے امامہ کو بے حد تکلیف ہوئی تھی اسے وسیم یاد آیا تھا۔ سعد یاد آیا تھا۔ اسے اپنا وہ خاندان یاد آیا تھا جو سارے کا سارا غیر مسلم تھا اور غیر مسلم ہی رہنے والا تھا۔ واپس تو یا وہ پلٹی تھی یا ہاشم مبین۔

"تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ بہت وقت لگا دیا میں نے تمہارے سامنے آنے میں۔ لیکن بس معافی مانگنا چاہتا تھا تم سے اور تمہاری ایک امانت تھی میرے پاس۔ وہ مرنے سے پہلے تمہیں دے دینا چاہتا تھا۔"

ہاشم مبین نے بالآخر اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اب اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اسے دے رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے لفافہ تھامے بغیر ان سے پوچھا تھا۔ "جائیداد میں تمہارا حصہ۔ اسی حصے کے لیے تمہارے بھائیوں کو خفا کر دیا ہے میں نے۔ وہ یہ بھی لے لینا چاہتے تھے مجھ سے۔ لیکن میں تمہاری چیز انہیں کیسے دے سکتا تھا۔ ساری عمر تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔ کچھ تو دینا چاہتا تھا تمہیں مرنے سے پہلے۔"

وہ ان کی بات پر رو پڑی تھی۔ "ابو! اس کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں اسے لے کر کیا کروں گی۔ اگر میرے بھائیوں کو میرا حصہ دے دینے سے ان کی زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے تو آپ یہ انہیں دے دیں۔"

ہاشم مبین نے بے حد مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "میں ان کے لیے اب "غیر مسلم" ہوں امامہ۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک چکے ہیں جیسے کبھی میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔" وہ شکست خوردہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"پھر آپ میرے حصے کو بیچ کر اپنے لیے کوئی گھر لے لیں۔ کوئی جگہ۔ میرے پاس اب سب کچھ ہے۔ کسی کوئی روپیہ پیسہ اب میری ضرورت نہیں رہا۔" امامہ نے وہ لفافہ پکڑ کر ان کے بیگ میں واپس رکھ دیا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ کو معاف کرنے نہ کرنے والی کون ہوتی ہوں ابو۔ یہ فیصلہ تو آپ کے لیے اللہ کو کرنا ہے۔ میں صرف یہ دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ آپ کو معاف کر دے۔ بڑی معافی تو وہاں سے آنی چاہیے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"تم ہم سے ملتی رہو گی نا؟" عجیب آس اور حسرت تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا تھا۔ ماں باپ کا یہ حال اسے مل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔ ہاشم مبین کے چہرے پر اس ملاقات کے دوران پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

"میں جائیداد کا یہ حصہ تمہارے بچوں کے نام کر دیتا ہوں امامہ۔"

"ابو میں آپ کی جائیداد اور روپے پیسے میں سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ میں لوں گی بھی تو سالار واپس کر دے گا۔" اس نے ہاشم مبین سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

ہاشم مبین کچھ دیر بیٹھ کر پھر اسے ساتھ لے کر اس کی ماں سے ملوانے گئے تھے۔ سکندر عثمان اور ان کی بیوی بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ ایک اور جذباتی ملاقات تھی۔

"تم اب بہت بہادر ہو گئی ہو۔" اس رات سالار نے اس سے کہا تھا۔ اس نے اپنے دن کی روداد سنائی تھی فون پہ۔

"کیسے؟" وہ اس کے تبصرے پر حیران ہوئی تھی۔ "تم آج ایک بار بھی روئی نہیں مجھے اپنے پیرنٹس سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے۔" وہ چپ رہی پھر اس نے سالار سے کہا۔

"آج ایک اور بوجھ میرے کندھوں اور دل سے ہٹ گیا ہے۔ بہت دیر سے ہی سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے گمراہی سے نکال ہی لیا ہے میرے ماں باپ کو۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ سالار! دیر سے ہی سہی پر قبول ہو جاتی ہیں۔" امامہ کے لہجے میں ایک عجیب طمانیت تھی جسے سالار نے ہزاروں میل دور بیٹھے بھی محسوس کیا تھا۔

"تمہاری ہو جاتی ہیں۔" اس نے مدھم آواز میں امامہ سے کہا۔

"کیا تمہاری نہیں ہوتیں؟" اس نے جواباً پوچھا۔

"میری بھی ہوتی ہیں لیکن تمہاری زیادہ ہوتی ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"الحمدللہ۔" امامہ نے جواباً کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ "تم میرے پیرنٹس کو اولڈ ہوم سے نکال کر ایک گھر لے دو سالار۔ ان کے پاس میرے لیے جائیداد کا جو حصہ ہے اسے بیچ کر۔ بے شک کوئی چھوٹا گھر ہو لیکن انہیں وہاں اولڈ ہوم میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"میں پاپا سے کہہ دوں گا وہ کر دیں گے یہ کام۔ ان کا خیال بھی رکھیں گے۔ تم اگر اسلام آباد میں مستقل رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو امامہ۔ تم اور بچے وہاں۔"

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "میں یہاں مستقل نہیں رہنا چاہتی۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں اور واپس آ رہی ہوں اسی تاریخ کو۔"

٭ ٭ ٭

سی آئی اے نے سالار سکندر کی اس سرگرمی کو صرف مانیٹر اور ریکارڈ نہیں کیا تھا انہوں نے اس ملاقات میں شامل پانچوں افراد کو بھی اپنی واچ لسٹ میں ڈال لیا تھا۔ اگلے آنے والے مہینوں میں سالار سکندر اور ان پانچ افراد

کے بہت سارے تفریحی دورے ہوتے رہے تھے۔۔۔ لیکن اب سی آئی اے صرف سالار سکندر کی نہیں ان پانچ افراد کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کر رہی تھی۔ ایک عجیب پراسرار نیٹ ورک کام کر رہا تھا۔ وہ پانچ افراد سالار سکندر سے صرف چند ماہ اچانک ملتے رہے تھے لیکن اس کے بعد سالار سکندر کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ پانچ افراد اب آپس میں بھی نہیں مل رہے تھے لیکن وہ پانچ افراد انفرادی طور پر ایسی ہی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ پیٹرن وہی تھا' چار پانچ اپنی اپنی فیلڈ کے ممتاز ترین لوگ۔ لیکن دنیا کے مختلف ممالک میں۔ سب ہی ایک ہی عمر کے دائرے میں اور سب ہی امریکن نیشنل۔ اور پھر یہ مماثلتیں ایک جگہ جا کر مرکوز ہو جاتی تھیں' وہ سب بھی مسلمان تھے۔ ان میں کچھ حافظ تھے۔ کچھ نہیں تھے لیکن وہ سب با عمل مسلمان تھے۔

وہ ایک اسلامی مالیاتی سسٹم پر کام کر رہے تھے اور یہ سی آئی اے جانتی تھی لیکن اس نظام کی شکل کیا تھی۔ خدوخال کیا تھے۔ وہ اسے بوجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اور اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ ایک جگسا پزل کی طرح اس نظام سے منسلک ہونے والے سب افراد کے پاس اس کا ایک ایک ٹکڑا تھا۔ اور وہ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا لیکن وہ ٹکڑا اس تصویر میں کہاں لگتا تھا' یہ صرف ایک شخص جانتا تھا۔ سالار سکندر۔

☆ ☆ ☆

"ممی! حمین کب بڑا ہو گا؟" اس دن جبریل نے اپنی آرٹ بک میں کچھ بناتے ہوئے امامہ سے پوچھا جو روتے بلکتے حمین کو ہمیشہ کی طرح تھپک تھپک کر خاموش کرنے اور کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں بے حال ہو رہی تھی اور اس کی یہ حالت جبریل اور عنایہ بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مہینے پہلے کانگو میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو تین مہینے رہنے کے بعد۔

"بڑا تو ہو گیا ہے۔" امامہ نے اس کے سوال اور انداز پر غور کیے بغیر کہا۔

"تو پھر روتا کیوں رہتا ہے؟" امامہ بے چارگی سے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ اس سے پوچھ لیں کہ اس کو کیا چاہیے۔" وہ امامہ کو جیسے مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔

"میں پوچھ نہیں سکتی اور وہ بتا نہیں سکتا۔" امامہ اب بھی اسے اٹھائے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئی اسے تھپک رہی تھی اور وہ اسی طرح روتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ وہ اسے نیچے بٹھا دیتی تو وہ پھر اٹھائے جانے کے لیے ہاتھ بلند کر کر کے دھاڑیں مارتا۔ اور یہ ڈرل دن میں دو تین بار کا معمول تھا۔ رونا حمین سکندر کا من پسند مشغلہ تھا۔ وہ بغیر آنسوؤں کے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا اور پھر رونے کے بیچوں بیچ کوئی بھی دلچسپ چیز نظر آنے پر یکدم رونا بند کر کے اس کا جائزہ لینے میں مصروف ہو جاتا اور جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ایک بار پھر اپنے رونے کے سلسلے کو وہیں سے جاری کرتا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔

سات آٹھ ماہ کی عمر میں ہی اس نے بیک وقت چار دانت نکالنے شروع کر لیے تھے جو خرگوش کے دانتوں کی طرح اس کے منہ کے درمیان میں تھے اور اس کے رونے اور ہنسنے پر نظر آتے تھے۔

"اس کو جلدی کس بات کی ہے؟" بیک وقت چار دانتوں کو نکلتے دیکھ کر سالار نے کہا تھا۔ جبریل اور وہ حمین سکندر کے بارے میں ایک جیسے تاثرات اور خیالات رکھتے تھے۔

"یہ تم خود اس سے پوچھ لو۔" امامہ نے جواب دیا تھا۔

حمین کو پالنا اس کے پہلے دو بچوں کی نسبت زیادہ تھکانے اور آزمانے والا کام ثابت ہو رہا تھا۔ حمین سکندر ان چار دانتوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی صرف بڑوں کے کھانے والی ہر اس چیز میں دلچسپی محسوس کرتا تھا جو چٹخارے والی ہوتیں۔ اپنے پوپلے منہ کے ساتھ بھی چپس اس کی پسندیدہ خوراک تھی جسے وہ صرف چبا نہیں نگل بھی سکتا تھا۔ وہ چپس کا پیکٹ تک پہچانتا تھا اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جبریل اور عنایہ اس کے قریب بیٹھ کر کوئی چیز اطمینان سے اسے کھلائے بغیر خود کھا لیتے۔

وہ ایک عجیب و غریب بچہ تھا۔ اور یہ بیان اس کے بارے میں سالار سکندر نے دیا تھا جس کا خیال تھا اس نے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔

سکندر عثمان نے اس سے کہا تھا "میں نے دیکھی ہے۔ وہ تمہاری کاپی ہے۔"

"یہ زیادتی ہے۔" سالار نے ان کی بات پر احتجاج کیا تھا۔ وہ اور طیبہ ان لوگوں کے پاس آئے ہوئے تھے جب وہ دونوں حمین سکندر کے ہاتھوں بننے والی ان کی درگت دیکھ رہے تھے۔ وہ تب بولنے لگا تھا اور سب سے پہلے جو لفظ اس نے بولنا شروع کیا تھا وہ "سالا" تھا اور ہر بار سالار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے حد خوشی سے ہاتھ پاؤں مارتا 'سالا' سالا' چلاتے ہوئے اس کی طرف جانے کی کوشش کرتا تھا۔

یہ پہلا لفظ تھا جو اس نے بولنا شروع کیا تھا۔ جبریل اور عنایہ کی طرح وہ بھی جلدی بولنا سیکھ رہا تھا۔ اس میں چیزوں کی شناخت اور پہچان کی صلاحیت بھی ان ہی دونوں کی طرح منفرد تھی لیکن اس کی بولنے کی صلاحیت ان دونوں سے بھی اچھی تھی

"بیٹا بابا!" پہلی بار سالار کے لیے یہ لفظ سن کر ہنسی سے بے حال ہونے کے باوجود امامہ نے اس لفظ کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سالار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے توڑ توڑ کر سکھا رہی تھی "با۔۔۔ با۔۔۔"

"سالا۔" حمین نے ماں کی محنت پر پانی پھیرتے ہوئے سالار کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جو وہ سالار کے لیے ماں کو پکارتے سنتا تھا۔

"تم اسے یہ بات سکھاؤ' صرف رکھوا دو میرے نام کے ساتھ' یہ بھی غنیمت ہو گا میرے لیے۔"
سالار نے اسے مشورہ دیا تھا۔ وہ سرحال کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا تھا اس طرز تخاطب سے جو سکندر عثمان اور طیبہ کے لیے ایک تفریح بن گئی تھی۔

اور پانچ سالہ جبریل بڑھاپے کے سے تحمل اور دانائی کے ساتھ اپنے اس اکلوتے چھوٹے بھائی کو دیکھا رہتا تھا جس نے ان کے گھر کے امن اور سکون کو پچھلے تقریباً "ایک سال سے ته وبالا کر کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا حمین بڑا ہو جائے اور چلنا شروع ہو جائے تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب بالآخر اس نے چلنا شروع کیا تو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس "مسئلے" کا غلط "حل" تھا۔

حمین سکندر کو پیر نہیں پر لگ گئے تھے۔ اور وہ اب کہیں بھی جاسکتا تھا اور کہیں سے مراد "کہیں" ہی تھا۔ اور اس کی فیورٹ جگہ باتھ روم تھی۔ وہ بھی وہاں اس وقت جانا پسند کرتا تھا جب جبریل اسے باتھ روم میں جاتا دکھائی دیتا۔ اور جبریل نے اس کے ہاتھوں کئی بار خاصی شرم ناک صورت حال کا سامنا کیا۔ جس باتھ روم کو بچے استعمال کرتے تھے اس باتھ روم میں لاک نہیں تھا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھولنا حمین کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جبریل کے لیے حمین کی موجودگی میں باتھ روم جانا جان جوکھوں کا کام بن جاتا تھا۔ وہ امامہ یا بڑی کے آس پاس نہ ہونے پر باتھ روم کے دروازے کے اندرونی طرف باتھ روم میں پڑی ان سب چیزوں کو رکاوٹوں کے طور پر دروازے کے سامنے ڈھیر کر کے پھر باتھ روم کا استعمال کرتا تھا۔

سالار سکندر اگر اسے "عجیب و غریب" کہتا تھا تو حمین سکندر باپ کے دیے گئے اس ٹائٹل پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری دل جمعی کے ساتھ۔ کبھی کبھی ان سب کو لگتا تھا' حمین سکندر کو کوئی بھی کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دنیا میں ہر فرعون را موسیٰ ہوتا ہے اور جنی کی ان کی زندگی میں آمد ایک ایسی ہی نعمت کے طور پر ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نائب صدر کے طور پر سالار سکندر نے افریقہ کے لیے کسی انسان کی طرح نہیں مشین کی طرح کام کیا تھا۔ اس کی ملازمت کا دورانیہ افریقہ کی تاریخ کے سنہری ترین سالوں میں گردانا جاتا تھا۔ وہ افریقہ میں تقرر ہونے سے پہلے افریقہ کی معیشت کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں اپنے قیام کے دوران سالار سکندر افریقہ کے انسائیکلو پیڈیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ افریقہ کا کوئی ملک یا علاقہ ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر نہیں تھیں اور جہاں اس نے کنیکٹس نہیں بنائے تھے۔

وہ ورلڈ بینک کی نمائندگی کرتے ہوئے افریقہ کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کی خواہش رکھتے ہوئے جیسے وہاں ایک دو دھاری تلوار پر چل رہا تھا۔ اسے ورلڈ بینک یعنی عالمی طاقتوں کے اہداف بھی حاصل کرنے تھے۔ انہیں ناراض بھی نہیں کرنا تھا اور اسے افریقہ میں افریقی عوام کی فلاح و بہبود کو بھی مد نظر رکھنا تھا۔ وہ مشکل ترین اہداف کے حصول کے لیے ناسازگار ترین حالات میں کام کر رہا تھا۔ اور کامیابی سے کر رہا تھا۔ پیٹرس ایباکا کی موت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ورلڈ بینک کے لیے ایک وقتی جھٹکا تھے۔ وہ مصلحتاً "پسپا ہونے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ افریقہ کے لیے عالمی طاقتوں کی پالیسیاں بدل گئی تھیں۔ اور سالار یہ بات بخوبی جانتا تھا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ سب کچھ نظروں سے اوجھل اور یادداشت سے محو ہونا شروع ہو گیا تھا۔ غریب قوموں کی یادداشت ان کے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ پیٹ خالی ہوتا ہے تو ان کی

یادداشت بھی خالی ہو جاتی ہے۔

پیٹرس ایباکا بھی بہت جلد اپنی قوم کی یادداشت سے غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور سالار کو اس بات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ابال ہے۔ جو کچھ عرصہ اس قوم کو مشتعل رکھے گا۔ اس کے بعد زمینی حقائق انہیں یہ سب بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور زمینی حقائق یہ تھے کہ افریقہ کے عوام اپنی ہر ضرورت کے لیے ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کرتے تھے۔ ان کی روزی روٹی ان کے پروجیکٹس میں کام کر کے ہی چلتی تھی۔ ان کے اپنے لیڈرز اور حکومتیں کرپٹ تھیں، چور تھیں، جو ملکی وسائل کو صرف اپنے فارن بینک اکاؤنٹس کو بھرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور حالات بدلنے کے لیے نہیں۔

افریقہ میں سب کچھ تھا۔ اپنے حالات بدلنے کی نیت نہیں تھی۔ اور یہ نیت کوئی دوسرا انسان ان کے اندر پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ سالار سکندر بھی نہیں اور یہ وہ حقائق تھے جن سے ساری دنیا واقف تھی تو افریقہ بھی انجان نہیں تھا۔

سالار سکندر کی وجہ سے اگر کوئی فرق پڑا تھا تو صرف یہ کہ اگر پہلے ان پروجیکٹس کا دس فی صد وہاں کے عوام کی بہتری پر خرچ ہو رہا تھا تو اب اس کا تناسب بیس سے تیس فیصد کے درمیان ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بڑی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ بیس سے تیس فیصد وسائل بھی اگر ٹھیک استعمال ہوتے تو وہاں بہتری کی رفتار چار گنا کی جا سکتی تھی اور یہ کام سالار نے کیا تھا۔ وہ ان وسائل کے استعمال کو سو فیصد شفاف نہیں بنا سکتا تھا لیکن اس کے استعمال کا فوکس ٹھیک کر سکتا تھا۔ ترجیحات درست کر سکتا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔

ایک نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اس کی اور اس کے آفس کی کارکردگی اور استعدادِ دنیا کے دوسرے خطوں میں کام کرنے والے نائب صدور کے مقابلے میں بہترین تھی۔ وہاں شروع ہونے والے پروجیکٹس کیس اسٹڈیز کے طور پر دوسرے خطوں میں ورلڈ بینک کے دوسرے نائب صدور اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ ورلڈ بینک کا سربراہ نہیں تھا لیکن سالار سکندر نے اپنے آپ کو بہت نمایاں نہ رکھتے ہوئے بھی ورلڈ بینک کے باقی تمام نائب صدور کو نہ صرف کنارے لگا کر غیر فعال کر دیا تھا۔ بلکہ ورلڈ بینک کے اس اگلے صدر کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا جسے پیٹرس ایباکا کی موت کے دوران پیدا ہونے والے کرائسس پر قابو نہ پا سکنے کی پاداش میں پرانے صدر کو ہٹا کر تعینات کیا گیا تھا۔

وہ تین سال "مسلسل" ٹائم کے مین آف دا ایئر کے طور پر اس کے سرورق کا حصہ بنا تھا اور ورلڈ بینک کے ساتھ ہونے والے اس پروجیکٹ کے بارے میں اختلافات سے پہلے وہ ورلڈ بینک کے حلقوں میں ایک بہت زیادہ پروفیشنل ورکر کی شہرت رکھتا تھا جو ہر لحاظ سے غیر متنازعہ اور بے حد اچھی شہرت کا مالک تھا۔ اور اب اس شہرت کو "خراب" کرنے والی شے صرف ایک تھی۔ اس کا "بنیاد پرست" مسلمان ہونا جو اس ایک تقریر کے علاوہ اور اس کے لائف اسٹائل کے علاوہ اس کے کام اور پالیسیوں میں کبھی نہیں جھلکا تھا۔

سالار سکندر کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا۔ بینک نے یہ دورانیہ ختم ہونے سے دو سال پیشتر ہی سالار سکندر کو ملازمت میں توسیع کی آفر کی تھی اور اس نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ پھر اس آفر کو وقفے وقفے سے بار بار بہتر پیکجز کے ساتھ اسے اصرار کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا۔ لیکن سالار کا انکار قائم رہا تھا۔ وہ افریقہ میں اپنے قیام کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن حکومت کے لیے بھی یہ تشویش کی بات تھی۔ افریقہ کو سالار سکندر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس بات پر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کوئی دو رائے نہیں تھیں اور نہ ہی امریکن حکومت کو کوئی شبہ تھا۔ اس نے پچھلے چند سالوں میں نہ صرف ورلڈ

بینک کی ساکھ اور امیج ہی افریقہ میں بدل کر رکھ دیا تھا بلکہ اس نے امریکن حکومت کے لیے بھی وہاں خیر سگالی کے جذبات دوبارہ پیدا کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کا ورلڈ بینک کو اس وقت چھوڑ کر جانا ان کے لیے بہت برا دھچکا ہوتا۔ لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں تھا اور امریکن حکومت کو سوچنا پڑ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی کیا چیز پیش کرے جو اسے روک سکے۔

ورلڈ بینک کی صدارت ہی یقیناً" ایسا ایک تاج تھا جو اس کو پہنا کر اسے روکا جا سکتا تھا۔ سالار سکندر اس عہدے کے لیے موزوں ترین اور کم عمر ترین امیدوار تھا مگر اس عہدے پر سالار سکندر کی تعیناتی امریکی حکومت کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ ایک "بنیاد پرست" مسلمان کو ورلڈ بینک کا صدر نہیں بنا سکتے تھے اور وہ اس "بنیاد پرست" مسلمان کو کسی اور چیز کی آفر کرکے روک بھی نہیں پا رہے تھے۔ یہ فیصلہ انہیں کرنا تھا کہ کیا اس کی مسلّم بنیاد پرستی کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی امریکی حکومت اور ورلڈ بینک کے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت تھا کیونکہ سالار کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے میں ایک سال باقی تھا۔

اس ایک سال میں سالار سکندر کی زندگی میں تین بڑے واقعات ہوئے تھے اور تینوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ گہرے اور ہمیشہ رہ جانے والے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ ان واقعات نے ایک بار پھر اس کی زندگی بدل دی تھی۔

چنی غلام فرید بھی اس کی زندگی میں اس کی آخری اور چوتھی اولاد کے طور پر اسی سال آئی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا بڑا واقعہ۔

☼ ☼ ☼

چنی سے سالار سکندر کا غائبانہ تعارف ہمیشہ بے نام رہا تھا۔ غلام فرید کے حوالے سے سکندر عثمان سے اسے کئی بار خبریں ملتی رہی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح گاؤں میں قائم اس اسکول کے بہت سے دوسرے ملازمین کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا' سکندر عثمان نے غلام فرید کے ذریعے گاؤں کی مسجد کے امام کو پہنچائی جانے والی امداد کے بارے میں بھی سالار کو مطلع کر دیا تھا کیونکہ یہ امداد سالار کے کہنے پر ہی سکندر عثمان نے شروع کی تھی۔ غلام فرید کو اس امداد میں ہیر پھیر کے نتیجے میں ملازمت سے فارغ کرنے کا حکم بھی سالار ہی کا تھا۔ بددیانتی اور بے ایمانی اس کے لیے قطعاً" ناقابل برداشت تھی اور یہ معاملہ اسے اس لیے زیادہ سنگین اور زیادہ ناقابل برداشت لگا تھا کہ جس رقم میں ہیر پھیر کیا گیا تھا وہ مسجد کے لیے دی گئی تھی اور مسجد کی رقم میں بددیانتی کرنے والے شخص کو وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ سکندر عثمان بھی غلام فرید کو دی جانے والی اس سزا کے حق میں تھے۔ اس لیے انہوں نے سالار سکندر کی ہدایات پر پوری طرح عمل درآمد کیا تھا۔

غلام فرید کے ہاتھوں ایک بچی کے سوا اپنے پورے خاندان کا قتل سکندر عثمان کو بری طرح ہلا گیا تھا۔ اس دل خراش واقعہ کو میڈیا نے بہت دن اچھالا تھا۔ غلام فرید سے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات وہ ہیڈ لائنز کی شکل میں دکھاتے اور چھاپتے رہے تھے جو صرف سکندر عثمان ہی نہیں سالار کی نظروں سے بھی گزرتے رہے تھے' حادثے کی توجیہات ہر روز بدل دیتا تھا۔ اپنی فیملی کو اس طرح بے رحمی سے مار دینے والا شخص میڈیا کو ذہنی عدم توازن کا شکار لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس

"اسے اپنی بیوی کے کردار پر شک تھا۔ اس لیے اس نے اپنے خاندان کو مارا۔"

یہ حادثے کے فوراً بعد میڈیا کی طرف سے بریکنگ نیوز حاصل کرنے کے چکروں میں نشر اور شائع ہونے والی

پہلی خبر تھی۔
یہ ایک غیر ذمہ دار صحافی نے "اندازاً" بنا کر اپنے ٹی وی پر نشر کی تھی اور باقیوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کی تھی۔ ڈیسک جرنلزم کی یہ چھوٹی سی بددیانتی کتنے سالوں بعد کسی شخص کے گلے کا پھندا بن جانے والی تھی یہ اس صحافی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔
جوں جوں غلام فرید سے مختلف صحافیوں کو ملنے اور بات کرنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ مختلف انکشافات سامنے آتے رہے۔ وہ پہلی خبر چھپ گئی تھی۔ اب اس قتل کی وجہ غربت سامنے آئی تھی۔ بیوی سے لڑائی جھگڑے تھے۔ گھر میں بھوک اور بیماری تھی۔ رشتہ داروں اور قرض خواہوں کے اپنی رقم کے تقاضے تھے۔ اور ان سب کے آخر میں اسکول کی ایک نوکری سے ایک مالی بددیانتی پر نکالا جانا اور بے گھر کیا جانا تھا جو سکندر عثمان اور سالار کو احساس جرم میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔
وہ اب غلام فرید کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس کی بچ جانے والی واحد اولاد کی دیکھ بھال اور کفالت کی ذمہ داری اٹھا لیتے اور سالار کے کہنے پر وہ سکندر عثمان نے اٹھائی تھی۔ وہ اس کے لیے ماہانہ رقم بھیجتے تھے جو اس کے رشتہ دار آ کر لے جاتے تھے اور کبھی کبھار سکندر عثمان کے کہنے پر وہ چنی کو لا کر انہیں دکھا بھی جاتے تھے تاکہ انہیں یہ تسلی رہے کہ وہ رقم واقعی اس پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی تھی اور وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ یہ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر اس سال سالار اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے پاکستان نہ آتا۔ اور ایک لمبے عرصے کے بعد سکندر عثمان کے بجائے خود گاؤں اسکول دیکھنے نہ جاتا یا وہاں جا کر غلام فرید کی بیٹی کا خیال آنے پر اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی اور ہمیشہ کی طرح چنی کے رشتہ دار کو چنی کو اسکول لے کر آنے کے بجائے اسکول ہی کی انتظامیہ کے چند لوگوں کے ساتھ سالار خود اچانک اس کے گھر نہ چلا جاتا۔
جس ڈیڑھ سال کی چنی کو سالار سکندر نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے سات آٹھ ماہ کی ایک بچی لگی تھی۔ بے حد کمزور۔ دبلی پتلی۔ اس کی سانولی رنگت یرقان جیسی پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ کسی جلدی انفیکشن کے نتیجے میں چھوٹے بڑے رستے والے پیپ زدہ دانوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال دھوپ گندگی میں رہ رہ کر بھوری لٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے جو دھلنے اور کنگھی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ادھڑے دھڑ پر جو فراک تھا۔ وہ بوسیدگی اور خستہ حالی کو تو ظاہر کر ہی رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے سائز سے بہت بڑا ہونے پر یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کوئی اور استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ جسم میں پانی کی کمی کا شکار ہو۔ ہاتھ پیروں کے بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ٹیڑھے میڑھے ٹوٹے ہوئے ناخن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی دیکھ بھال کتنے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔
جس وقت سالار اس گھر کے صحن میں داخل ہوا وہ گھر کے کچے صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پاس بیٹھی تھی اور اسی دانے اور گندگی کو بلا تکلف اپنے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سالار نے اس بڑے صحن کے ایک کونے میں مرغیوں کے پاس بیٹھی اس بچی کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی کفالت کے لیے معقول رقم بھیجنے کے باوجود وہ اس حال میں ہو سکتی تھی۔
چنی کے رشتہ دار بے حد نروس اور گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ سالار کو اندر لائے تھے اور مہمان خانے میں اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ سالار کو جلدی تھی۔ اسے صرف ایک نظر اس بچی کو دیکھنا تھا اور واپس جانا تھا۔ گھر کے

[illegible]ے میں جانے کے بجائے یہ کام وہ وہیں صحن میں کھڑے کھڑے نمٹانا چاہتا تھا اور جنی کے رشتہ داروں کی [illegible]تی اور جنی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت وہیں صحن میں تھی وہ لوگ presentation اور display [illegible]نگامی بنیادوں پر اسے اب سجا سنوار نہیں سکتے تھے۔

"[illegible] بس ایسے ہی رہتی ہے۔ جتنی بار بھی کپڑے بدلو' یہ جا کر مرغیوں میں گھس جاتی ہے۔ حمیدہ! ارے او حمیدہ! [illegible] جنی کو کپڑے بدلوا' صاحب نے ملنا ہے۔"

[illegible]ر کے مالک نے بے حد گھبرائے اور شرمندہ سے انداز میں جنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو آواز لگائی [illegible] اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے جنی کو بغور دیکھا تھا اور وہ بھی اپنا نام پکارے جانے پر کچھ خوف زدہ انداز میں [illegible] کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

حمیدہ نے ہنگامی بنیادوں پر لپک کر جنی کو اندر لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن سالار نے روک دیا' وہ جو چھپانا [illegible]تے تھے اسے چھپا نہیں پائے تھے اس لیے وہ اسے سالار کے پاس لے آئے تھے۔

حمیدہ کی گود میں اٹھائی ہوئی' بہتی ہوئی زخم زدہ ناک والی اس بچی کو دیکھتے ہوئے سالار سکندر کو عجیب رحم آیا تھا [illegible] پر۔ وہ افریقہ میں بچوں کو اس سے بھی برے حالات میں دیکھ چکا تھا لیکن ان بچوں کے ساتھ سالار سکندر کا [illegible]وئی احساس جرم نہیں تھا۔ جو جنی کو دیکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا۔

"نہیں' نہیں۔ اس کو نہ اٹھائیں' یہ بچی گندی ہے جی۔ آپ کے کپڑے نہ خراب کر دے۔ اس کو ابھی [illegible] لیٹرین میں جانا نہیں آیا۔"

حمیدہ سے پہلے اس کے میاں نے سالار کو اس بچی کو اٹھانے سے روکا تھا۔ سالار نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بچی کو اٹھا لیا تھا اور جنی بڑے آرام سے کسی جھجک کے بغیر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر جیسے حلیے والا کوئی شخص دیکھا تھا۔ سالار نے اسے تھپکتے ہوئے پچکارا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے جواب دیے بغیر لیکن اس سے چپکے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔

"ہاں جی بس تھوڑی بیماری رہتی ہے۔ شروع سے ہی ایسی ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے فرق نہیں پڑا۔ اب پیر صاحب سے دم کرا کے لائے ہیں۔ انہوں نے تعویذ بھی دیا ہے گلے میں ڈالنے کے لیے۔ حمیدہ! او تو نے ڈالا نہیں ابھی تک۔"

سالار میاں بیوی سے اب اس بچی کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ گڑبڑائے ہوئے اس کے چہرے اور جسم پر رستے ہوئے دانوں کی وجوہات اور علاج بیان کر رہے تھے۔

سالار سکندر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط جگہ پر تھی۔ اس کا خیال نہیں رکھا جا رہا تھا اور اس کی کفالت کے لیے دی جانے والی امداد اس پر استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی ذہنی رو تھی جس میں اس نے جنی کو فوری طور پر وہاں سے لے جانے اور کسی دارالامان میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا تھا یا کسی ایسی جگہ۔ جہاں پر وہ بچی اچھی طرح پرورش پا پاتی اور اس ذہنی رو میں یہ فیصلہ اس نے جنی کے رشتہ داروں کو سنا بھی دیا تھا۔ ان کے احتجاج کے باوجود وہ جنی کو وہاں سے لے آیا تھا اور وہ اسے روک نہیں پائے تھے۔ بد حواسی اور پریشانی کے باعث بہت ساری فکریں لاحق ہو گئی تھیں۔ وہ جنی کو نہیں لے جا رہا تھا۔ ان کا ماہانہ وظیفہ لے جا رہا تھا اور وہ پیسے بند ہو جاتے تو۔ اس تو کے آگے ان سب کو [illegible] لیکن سالار کے ساتھ اسکول کی انتظامیہ بھی تھی اور کچھ سیکیورٹی اہلکار بھی' وہ زبانی احتجاج کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ اس سارے شور شرابے اور احتجاج میں جنی بے حد اطمینان اور پرسکون انداز میں سالار کی گود میں چڑھی اس کا کالر پکڑے رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بھی وہ بے قرار اور پریشان

نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھائے جاتے ہوئے۔

اس گاؤں سے اسلام آباد واپسی پر سالار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا رہا تھا اور جنی برابر والی سیٹ پر بیٹھی دروازے کی کھڑکی سے چپکی بے حد خاموشی اور اطمینان سے پورا راستہ باہر دیکھتی رہی تھی۔ وہ اگر بے چین ہوئی تھی تو صرف تب جب سالار نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اسے سیفٹی بیلٹ باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جو اس کے ہاتھ پاؤں مارنے پر سالار نے کھول دی تھی۔ اسے اس وقت حمین یاد آیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں اسی طرح سیفٹی بیلٹ سے جان چھڑاتا تھا۔

سیفٹی بیلٹ کھول دیے جانے پر وہ ایک بار پھر سے پرسکون ہو گئی تھی۔ پورا راستہ سالار اسے وقتاً" فوقتاً" دیکھتا رہا لیکن وہ اس قدر اطمینان کے ساتھ شیشے سے باہر نظر آنے والی سڑک اور اس پر گزرنے والی ٹریفک کو دیکھنے میں مگن تھی کہ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر گاڑی کے اندر موجود سالار کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سالار اس کا یہ انہماک دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ اس نے رستے میں ایک جگہ رک کر اسے ایک جوس کا ڈبہ اور بسکٹ کا ایک پیکٹ لے کر دیا تھا۔ وہ منٹوں میں وہ دونوں چیزیں کھا گئی تھی یوں جیسے وہ کئی دنوں کی بھوکی تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کے سفر کے دوران سالار اس بچی کی رہائش کے لیے مناسب ترین جگہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے خود پالے گا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو بھی یہ کام امامہ سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔

جو بھی ممکنہ باتیں جنی کے لیے اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ وہ خود ہی انہیں مسترد کرتا رہا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے پر گھر کے گیراج میں اس کے بچوں نے بھاگتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور گاڑی کے اندر جنی کو سب سے پہلے ساڑھے تین سالہ حمین نے دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح گول ہو گئی تھیں یوں جیسے اس نے جنگل کا کوئی جانور دیکھ لیا ہو۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے ناک اور منہ چپکائے ہیلو کہہ کر جنی کو مخاطب کیا تھا جو کھڑکی کے اندر والی سائیڈ سے شیشے سے چہرہ چپکائے ہوئے تھی اور حمین دوسری طرف سے۔ وہ کچھ خائف ہو کر تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ اس سے پہلے کہ حمین کوئی اور حرکت کرتا۔ سالار گاڑی سے نکل کر دوسری طرف آ چکا تھا۔ اس نے حمین کو ہٹا کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور جنی کو باہر نکال لیا۔ جنی سے آنے والے بدبو کے بھبکے سب سے پہلے حمین نے ہی محسوس کیے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Oh my God! she is so smelly and dirty and ugly"

(او مائی گاڈ! یہ کتنی بدبودار، گندی اور بدصورت ہے) وہ بے اختیار ناک پر ہاتھ رکھے کہتا گیا تھا جبکہ جبریل اور عنایہ کچھ فاصلے پر کھڑے کسی تبصرے اور سوال کے بغیر گھر میں باپ کے ساتھ آنے والے اس مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

"حمین۔" سالار نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں پکارا اور گھورا۔

Oh but then that's ok —
May be she likes to live like this
I mean some people like to be different
I like her hairstyle — She is cool —

(لیکن ٹھیک ہے۔ شاید اسے اسی طرح رہنا پسند ہو، میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگ مختلف ۔۔۔ ہوتے ہیں مجھے اس کا ہیئر اسٹائل اچھا لگا ہے۔ یہ کول ہے")

حمین نے ہمیشہ کی طرح باپ کی پھٹکار کے بعد سیکنڈز میں اپنا بیان تبدیل کیا اور اپنی بات کے آخر میں جنی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔
"Baba I also want to have her hair style"
(بابا میں بھی اس کی طرح ہیئر اسٹائل بنانا چاہتا ہوں)
سالار نے اس کی زبان کی قینچی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سائز کا خاموش نہ ہونے والا "جن" تھا جو اس گھر کے افراد کے ارد گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اور اس کے سوالات۔ ختم نہ ہونے والے سوالات نے امامہ اور سالار کی آئیڈیل والدین بننے کی ہر خواہش، خبط اور معلومات کو ختم کر دیا تھا۔
"I think she is goldi lock"
حمین کی تعریفوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اب باپ کو یہ جتا کر خوش کرنا چاہتا تھا کہ اسے وہ بچی اچھی لگی تھی۔
"یہ گولڈی لاک نہیں ہے گندی ہے اس نے کئی ہفتوں سے اپنے بال نہیں دھوئے بلکہ شاید کئی مہینوں سے۔"
جبریل نے اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ تینوں اب سالار کے پیچھے پیچھے اندر جا رہے تھے۔
"یو آر رائٹ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کول نہیں ہے۔"
جواب پھر سے تڑاخ سے ہی آیا تھا جبریل بے اختیار پچھتایا۔ اس نے اس کے تبصرے کا جواب دے کر سالار کے پیچھے لگنے والی بلا اپنے پیچھے لگا لی تھی۔
"اگر میں کئی مہینوں تک اپنے بال نہ دھوؤں تو میرے بال بھی ایسے ہی ہوں گے میرا مطلب ہے گولڈن براؤن یا ایش گرے یا سٹوڈیو۔" اس کا ذہن اب کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔
"نہیں۔" جبریل نے بے حد سخت لہجے میں فل سٹاپ لگایا۔
"اوکے۔" حمین نے بے حد اطمینان سے کہا "لیکن میں اپنے بال ڈائی تو کر سکتا ہوں۔"
جبریل نے اس بار اسے مکمل طور پر نظرانداز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ بالوں کے بعد جنی جیسے ناخنوں کو بھی اپنانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دے۔
امامہ نے سالار کو اس بچی کو اٹھائے دیکھا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ بیٹھی اس وقت چائے پی رہی تھی اور وہ چائے پینا ہی بھول گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ تم اسے نہلا کر کپڑے بدل دو اس کے، پھر میں اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے جنی کو گود سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

امامہ کچھ الجھی تھی لیکن وہ اسے لے کر چلی گئی تھی اور اس کو نہلانے کی کوشش کے آغاز میں ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بچی کے بالوں کو کاٹے بغیر اس کو نہلایا نہیں جا سکتا۔ اس کے سر میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور ان پھوڑوں سے رسنے والی پیپ نے اس کے بالوں کی لٹوں کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا تھا کہ اب ان کا سلجھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے شیونگ کٹ میں پڑی قینچی سے جنی کے سارے بال جڑوں تک کاٹ دیے تھے۔ اس کا سر گنجا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ امامہ کو اس بچی کو نہلاتے ہوئے بہت رحم اور ترس آیا تھا اور بے حد حیرانی بھی ہوئی تھی اسے۔ جنی بالکل چپ چاپ بیٹھی نہاتی رہی تھی۔ اس نے عام بچوں کی طرح رونا دھونا نہیں مچایا تھا۔ نہ ہی اپنے بال کٹنے یا ان پھنسیوں اور پھوڑوں پر ہاتھ لگنے پر کسی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

بیڈ روم میں جبریل اور عنایہ باتھ روم میں جا کر اس بچی کی صفائی ستھرائی کو بذات خود جا کر دیکھنے سے حمین کو روکنے کی کوششوں میں مصروف تھے جنہیں اس کام پر امامہ تعینات کر کے گئی تھی۔

وہ بالآخر جب جنی کو بالکل کریو کٹ میں نہلا دھلا کر حمین ہی کا ایک جوڑا پہنائے باہر لائی تھی تو اسے دیکھ کر سب سے پہلی چیخ مارنے والا حمین ہی تھا۔

"Oh my God! Momy you have made her ugiler horrible and you have destroyed my most favourite shirt

"او مائی گاڈ ممی! آپ نے اسے مزید بد صورت۔ خوفناک بنا دیا ہے اور آپ نے میری سب سے فیورٹ شرٹ بھی خراب کر دی ہے۔"

اس کو ہرا غم تھا جنی کے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی شرٹ کو اس کے جسم پر دیکھ کر بھی دکھ ہوا تھا۔

"Momy she was a girl. You have made her a boy. God will never forgive you for that.

"ممی یہ لڑکی تھی۔ آپ نے اسے لڑکا بنا دیا۔ اللہ اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کرے گا۔"

امامہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی۔ سالار ٹھیک کہتا تھا۔ وہ "عجیب و غریب" ہی تھا اور جنی اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے۔ اپنے اس نئے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے آئی تھی لیکن اس وقت کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہمان نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

اس سال صرف جنی سالار سکندر کے خاندان میں نہیں آئی تھی۔ اس سال کا دوسرا بڑا واقعہ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی تشخیص تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)